امرتا پریتم

ایک سوال

ایک سوال

امرتا پریتم

چودھری اکیڈمی لاہور

۳۰۵۔ ذوالقرنین چیمبرز۔ گنپت روڈ۔ انار کلی

درِ جمیل پہ سورج برات لے آیا
کوئی کرن بھی قدم اٹھ کر اُسکے لے نہ سکی
ہمارے عشق نے سادہ سا اک سوال کیا
کہ حسن کا ساری خدائی جواب دے نہ سکی

ناشر ——— محمد خالد چودھری
اہتمام ——— میاں محمد اسلم
طابع ——— نیازی پرنٹنگ پریس
قیمت ——— نو روپے

چودھری اکیڈمی - لاہور

یہ سوال اس کے لیے ہے جس نے مجھ سے کہا تھا

—— مجھے سر تا پا جواب بنا لو ——

دیباچہ

پورے گیارہ سال کی نہیں تھی جب ماں فوت ہوئی۔ ماں کی زندگی کا آخری
دن چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ میری یاد میں محفوظ ہے" ایک سوال" ناول میں
ناول کا ہیرو جگدیپ مرتی ماں کے بستر کے پاس جس طرح کھڑا ہے، اسی طرح میں
اپنی مرتی ماں کے بستر کے پاس کھڑی تھی اور میں نے جگدیپ کی مانند دل اور ذہن
کی یکسوئی کے ساتھ خدا سے کہا تھا" میری ماں کو نہ مارنا" اور مجھے بھی اس کی طرح
یقین ہو گیا تھا کہ اب میری ماں نہیں مرے گی کیونکہ خدا بچوں کا کہا نہیں ٹالتا۔۔۔
لیکن ماں مر گئی تھی اور میرا بھی جگدیپ کی طرح خدا پر سے اعتقاد اٹھ گیا تھا۔

اور جس طرح جگدیپ اس ناول میں ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی اور ایک
طاق پر رکھی ہوئی دو سوکھی روٹیوں کو اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیتا ہے" ان روٹیوں
کو تھوڑا تھوڑا کر کے کئی دن کھاؤں گا" اسی طرح میں نے ان سوکھی روٹیوں کو
پیس کر ایک شیشی میں ڈال لیا تھا۔

۱۵ مئی ۱۹۷۳ء کو جب دہلی یونیورسٹی نے آنریری ڈی، لٹ کی ڈگری
عطا کی تو گھر آنے پر دیویندر نے اپنی جیب میں کچھ چھپا کر کہا" دیدی آج کوئی من آئی
کرنے کو جی چاہتا ہے ناراض نہ ہونا" جواب میں ہنس پڑی تھی" اسے، تیری
من آئی مجھے بھی ہو گی اچھی ہو گی" اور دیویندر نے جیب سے ایک ریشمی رومال،

مصری اور اکیس روپے نکال کر کہا "دیدی! آپ کا کوئی باپ یا بھائی ہوتا۔ کوئی شگن کرتا۔ یہ شگن ان کی طرف سے۔" آنکھیں بھر بھر آئیں اور یاد آیا" ایک سوال" ناول میں جب ناول کا ہیرو اپنے باپ کی موت کے بعد اپنی بھرپور جوان سوتیلی ماں کی اپنے ہاتھ سے اس کی من چاہی شادی کرتا ہے۔ اور وہ پُرشباب لڑکی تھالی میں روٹی پروس کر کہتی ہے۔ آؤ ماں بیٹا مل کر کھائیں۔ تو وہ روٹی کا پہلا لقمہ توڑتے ہوئے کہتا ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم میری ماں لگتی ہو بہن لگتی ہو یا میری بیٹی لگتی ہو؟ تب ناول کا یہ حصہ لکھتے ہوئے دیویندر میرے سامنے نہیں تھا لیکن چودہ سال بعد جب دیویندر نے وہ رومال وہ مصری اور وہ روپے میری جھولی میں ڈالے تو میرے دل میں آیا بول بعینہ وہی تھا" ارے، پہلے یہ بتا، تو میرا باپ لگتا ہے یا میرا بھائی کہ میرا بیٹا؟

نئی دلی امرتا پریتم

"اٹھ دیپ"!

"دیپ اٹھو ——— میری طبیعت اچھی نہیں ہے ———"

جگدیپ ماں کی آواز سن کر چونک پڑا ——— ماں اس کے ماتھے پر نرم نرم ہاتھ پھیر رہی تھی اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑا ہوا تھا، دس برس کا جگدیپ آنکھیں ملتا ہوا ماں سے لپٹ گیا۔

"آہستہ میرے چاند ——— آہستہ ——— مجھے سخت درد ہو رہا ہے ———" ماں نے چارپائی کی پٹی کو مضبوطی سے پکڑ لیا ——— "نہ جانے پھر کبھی میں اپنے ہاتھوں سے تجھے کچھ کھلا سکوں گی کہ نہیں ——— جا میرے سورج کنوئیں پر ایک ڈبکی لگا کر میرے پاس آجا ———"

ماں کپکپاتی ہوئی چارپائی کی پٹی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر دالان میں پڑی ہوئی پیڑھی پر بیٹھ کر چھاچھ بلونے لگی۔

جگدیپ کنویں تک گیا اور الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ ماں کے قریب آکر بولا ———

"تیری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ماں تو چچی سے چھاچھ بلونے کے لیے کہہ دے"

"چچی ہی سے کہوں گی میرے چاند ——— ذرا ایک گھونٹ یہ ادھ بلوئی چھاچھ پی لے"

پچھلے تین روز سے ماں کے بدن میں ایک درد اٹھ کھڑا ہوا تھا ——— گاؤں کے

حکیم نے پہلے تو چٹر کا مربہ دیا۔ پھر دودھ میں ایک پڑیا گھول کر دی اور اب کل رات کو حکیم کہہ گیا تھا ـــــ "شہر سے ڈاکٹر بلوالو ـــــ یہ تو کوئی غیبی مرض معلوم ہوتا ہے"۔

"ماں قربان جائے ـــــ یہ گھونٹ بھی پی لے ـــــ" ماں نے پھر کہا اور دیپ نے کٹورے میں باقی چند قطرے بھی حلق میں انڈیل لیے۔

ماں سچ کہتی تھی! اس گھڑی کے بعد وہ پیڑھی پر نہ بیٹھ سکی ـــ چارپائی پہ سے اٹھنا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی ـــــ دوپہر ہوئی تو دیپ کا والد گھوڑی پر سوار ہوا اور شہر سے ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لے آیا ـــــ شہر ان کے گاؤں سے کوئی تین کوس کے فاصلہ پر واقع تھا۔

"مجھے ایسا شک ہو رہا ہے کہ ان کے پیٹ میں رسولی ہے آپریشن کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ـــــ" ڈاکٹر نے آدھ گھنٹہ کے معائنہ کے بعد کہا۔

"میں شہروں میں خوار ہو کر نہیں مروں گی ـــــ میں کہیں نہیں جاؤں گی ـــــ مروں گی تو اپنے گھر میں مروں گی ـــــ دیپ کی ماں نے یہی ایک رٹ لگانی شروع کر دی۔

"بہت اچھا آج دوا دیکر دیکھ لیتے ہیں ـــــ مجھے کل صبح ہی دوبارہ مطلع کر دینا"۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا ـــــ دوا دی اور واپس چلا گیا۔

دو گھنٹے تک ماں پرسکون رہی ـــــ دیپ صبح ہی سے ماں کی چارپائی کے پاس جم کر بیٹھا تھا ـــ چچی نے اس سے ـــ "جا بیٹا جا کر کھیل ـــــ ماں کا بال بیکا نہیں ہوگا"۔

چچی دراصل دیپ کی موسی تھی۔ دونوں بہنوں کا ایک ہی گھر میں بیاہ ہوا تھا ـــــ دونوں بھائیوں سے بیاہی گئی تھیں۔ اگرچہ لوگ اسے دیپ کی چچی کہتے تھے۔ مگر وہ دل موسی کا رکھتی تھی دیپ نے بڑے غور سے چچی کی طرف دیکھا۔ چچی کے چہرے پر گھبراہٹ کی علامت نہیں تھی دیپ نے اطمینان کا سانس لیا اور کھیلنے کے لیے باہر چلا گیا۔

شام کو دیپ نے جب گھر کی دہلیز میں قدم رکھا تو ماں کی چیخیں باہر دالان میں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ دیپ ماں کی چارپائی کی طرف لپکا۔ چچی توے پر روٹی گرم کر کے ماں کو سینک پہنچا رہی تھی اور اس کا والد دوا کی خوراک کٹوری میں ڈال کر ماں کی طرف بڑھا رہا تھا۔

دیپ وہیں کا وہیں دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا ——— ماں آدھ گھنٹہ تک چیخوں کے ساتھ زور آزمائی کرتی رہی —— پھر آہستہ آہستہ درد ٹھنڈا پڑتا گیا اور جب دوبارہ ماں کے دم میں دم آیا تو کمرے میں مسلط اندھیرے کو ماں نے ٹٹولتے ہوئے پوچھا "میرا دیپ کہاں ہے —؟"

"یہ کیا بے حس و حرکت کھڑا ہے" چچی نے دیپ کا بازو پکڑ کر اسے ماں کی چارپائی کے قریب کر دیا۔

"میرے کنول کے پھول — تو رونا کیوں ہے — ؟ پاگل کہیں کا — ! کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں ——— چاچی سے کچھ لیکر کھا لے۔"

ماں کے انگ انگ پر دوا اپنا اثر کر رہی تھی —— پھر نصف سے زائد رات سوتے سوتے گزر گئی۔

صبح کا پہلا پہر ایک بار پھر ماں کی چیخوں سے طلوع ہوا۔ ایک گھنٹہ درد یوں ہوتا رہا جیسے کوئی سوئیاں چبھو رہا ہو اور اس کے بعد ایک بار پھر دوا نے ماں پر غنودگی طاری کر دی اور وہ غفلت کی نیند سو گئی۔

اگلے دن دوپہر کو ماں نے دیپ کو اپنے پاس بلا کر کہا —— "جا۔ نوراں کی ماں کو بلا لیا —— کہنا ذرا ایک کے آئے ——"

نوراں کا گھر دور نہیں تھا —— دیپ الٹے پاؤں لوٹ آیا —— اس کے پیچھے

پیچھے نوراں کی ماں آگئی ـــــ اس کے ساتھ ساتھ سات آٹھ برس کی نوراں دوڑتی آ رہی تھی۔

"میں تو ابھی ابھی نوراں کے ننہال سے آ رہی ہوں ـــــ آتے ہی سنا کہ سیٹھانی بیمار ہے ـــــ اتنے میں دیپ پہنچ گیا۔۔ کہتے ہیں شہر سے ڈاکٹر بھی آیا تھا۔ اے خدا ہماری شاہنی پر کوئی آنچ نہ آئے ـــــ" نوراں کی ماں کو سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ اور کیا کچھ کہے ـــــ اس کا گلا بھر آیا۔

"بیگم ـــــ اس دم کا کیا بھروسہ ـــــ ابھی سانس آتا ہے اور ابھی کچھ خبر نہیں رہتی ـــــ مجھے تیری امانت لوٹانا ہے ـــــ" دیپ کی ماں نے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی چارپائی پر بٹھا لیا۔

"کیسی امانت شاہنی ـــــ؟ تجھے خدا سلامت رکھے ـــــ!"

"پھر بھی بیگم ـــــ نہ کوئی لکھت نہ پڑہت ـــــ"

"ہمارے لیے شاہنی ـــــ توہے تو جہان ہے ـــــ"

"دیپ، ذرا ادھر آ ـــــ یہ لے چابی ـــــ پچھلے کمرے میں لوہے کا صندوق کھول کر لکڑی کا ڈبہ نکال کر لے آ ـــــ"

بیگم روکتی رہی لیکن ماں نے چابی دیپ کے ہاتھ میں تھما دی اور وہ صندوق میں سے ڈبہ نکال کر لے آیا ـــــ ماں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے ڈبہ کھولا ـــــ۔

"یہ رہی تیری امانت بیگم ـــــ"

"تیرے سوا ہمارا کون ہے شاہنی ـــــ" بیگم نے دوپٹے کے کنارے سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور کہا ـــــ "تو اچھی بھلی ہے شاہنی ـــــ میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جاؤں گی۔ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے ـــــ"

"نہیں بیگم ــــ میں زندہ رہی تو ــــ" ماں کے پھر درد اٹھا ــــ زیورات کی پوٹلی بیگم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے کہا ــــ "اپنی چیزیں گن کر پوری کر لے۔ اور دیپ تو جا کر صندوق بند کر دے۔"

دیپ نے واپس آ کر ماں کو جب چابی لوٹائی تو درد کے مارے اچھل اچھل پڑ رہی تھی۔

"میں نے دیپ کی بہو کے لیے ستاروں کا جمّا ہوا دوپٹہ رکھا ہوا تھا اور چاندی کے گھنگھروؤں والی پازیب ــــ لیکن دیپ کی بہو کا منہ دیکھنا شاید میرے نصیب میں نہیں تھا ــــ میرے دیپ کی جھلمل کرتی ہوئی بہو ــــ چھم چھم کرتی ہوئی میرے دیپ کی دلہن ــــ میرے ایسے نصیب کہاں تھے۔!

ماں کی چیخیں بڑھتی گئیں۔ اور آہ وزاری میں اضافہ ہوتا گیا۔

"میں دنیا کی چیز سنبھال کر رکھتی تھی بیگم ــــ آج اپنی چیز دنیا کو دیے جا رہی ہوں ــــ میری امانت ــــ میرا دیپ!" ماں کا دل اس کے ہونٹوں پر تڑپ رہا تھا۔

جگدیپ کا والد گھوڑی پر سے اترا۔ ڈاکٹر اس کے ساتھ تھا۔ پندرہ پندرہ منٹ کے وقفہ کے بعد ماں کے دو انجکشن لگائے گئے تو ماں کی چیخیں دھیمی پڑ گئیں اور اس کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔

"رویا نہیں کرتے میرے چاند ــــ" چچی نے قریب آ کر جگدیپ کو پیار دیا۔ اور کہا ــــ "بھگوان کا نام لو ــــ شاید اسے ترس آ جائے ــــ بچوں کا کہا وہ کبھی بھی نہیں ٹالتا ــــ"

"آ میرے چاند ــــ باہر چل ــــ شانتی کی آنکھ لگ گئی ہے ــــ شاید تھوڑی دیر کے لیے آرام سے لیٹی رہے ــــ" بیگماں نے جگدیپ کا بازو پکڑ لیا ــــ دیپ وہیں کا وہیں کھڑا رہا ــــ جیسے وہ دھرتی اسے حرکت نہیں کرنے دے رہی تھی۔

باہر دالان میں دیپ کے والد نے ڈاکٹر کے لیے چارپائی بچھا دی تھی انہوں نے آج کی رات ڈاکٹر کو اپنے گاؤں میں قیام کرنے کے لیے کہہ رکھا تھا۔ ڈاکٹر نے باقی عورتوں کو بھی حکم دیا کہ وہ کمرے سے باہر آجائیں۔

"لڑکا ابھی نوخیز ہے —— کہیں غم دل کو نہ لگا بیٹھے —— اس سے کہہ دو کہ باہر جاکر کھیلے ——" بیگم بولی۔

چچی نے بڑی منت سماجت کی لیکن جگدیپ نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ جگدیپ کے کانوں میں ابھی تک چچی کے وہ الفاظ گونج رہے تھے —— "بھگوان کا نام لو —— شاید اسے ترس آجائے —— بچوں کا کہا وہ کبھی نہیں ٹالتا ——" اور جگدیپ نے سوچا کہ وہ ایک ہی جگہ کھڑا رہ کر بھگوان کے آگے گڑگڑاتا رہے گا۔

شام کا دھندلکا پھیل گیا —— چچی نے کمرے میں دیا جلا دیا —— جگدیپ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔

"لڑکے کو کچھ ہو نہ جائے —— پتھر کی مورت بن کر کھڑا ہے ——" چچی نے باہر جاکر کہا۔

"میری تو ایک نہیں سنتا —— واسطے دیتے دیتے ہار چکی ہوں۔ صبح سے پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا ——" چچی نے دوبارہ کہا۔

ماں بدستور بے ہوش پڑی ہوئی تھی —— جگدیپ ویسے کا ویسا دریچے کی آڑ میں کھڑا ہوا تھا۔

پھر جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا کہ ایک ننھا سا ہاتھ اسے کھینچ رہا ہے —— دونوں آنکھیں بند کرکے وہ بیخودی کے عالم میں گم تھا —— اسے یوں لگا جیسے بھگوان اسے مل گیا

بو ــــ ہر بڑا کراس نے آنکھیں کھولدیں ــــ تو راں اسکا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کی طرف کھینچ رہی تھی۔

بیگماں چلی گئی ــــ مزاج پُرسی کے لیے آتے ہوئے دوسرے لوگ بھی چلے گئے چچی نے

تنور میں روٹیاں لگائیں ــــ کسی نے آدھی کھائی اور کسی نے صرف ایک نوالہ ہی توڑا۔ چچی نے

کمرے میں آکر کہا ــــ "بہن کا سانس اکھڑا ہوا ہے"

سب طرف کھلبلی مچی ہوئی تھی ــــ لیکن چیخوں کی آواز اب نہیں آرہی تھی۔ جگدیپ

کو یوں محسوس ہوا ــــ "یہ سب یونہی گھبرا رہے ہیں۔ ماں کے اب درد نہیں ہو رہا۔ میں

بھگوان کے آگے بہت گڑگڑایا ہوں ــــ وہ بچوں کا کہا کبھی نہیں ٹال سکتا ــــ"

نہ درد اٹھا نہ چیخوں کی آواز آئی ــــ رات لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

جگدیپ حیران تھا کہ ماں کے درد نہیں ہو رہا۔ لیکن یہ ماجرا کیا ہے کہ نہ تو ڈاکٹر سوتا ہے اور

نہ گھر والے سوتے ہیں۔ چچی کی ایک بار پھر آواز آئی ــــ "کوئی کوئی سانس آرہا ہے۔"

اس کے بعد سارے گھر کی چیخوں نے رات کا سینہ چیر کر رکھ دیا ــــ جگدیپ

نے دیکھا کہ ہر کوئی چیخ رہا ہے اور ان کی چیخوں میں ماں کی چیخ سنائی نہیں دے رہی۔

ایک ہفتہ ہو گیا تھا ــــ ماں کی چیخوں پر سب ہی گھبرا اٹھتے تھے۔ آج ماں کی

چیخیں بند ہو چکی تھیں مگر گھر والوں کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

"میرے بچے ــــ" چچی نے قریب آکر جگدیپ کو چھاتی سے لگالیا ــــ "اب ماں

ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملے گی ــــ"

جگدیپ کی دونوں مٹھیاں بھنچی رہیں ــــ بھگوان کسی کی نہیں سنتا ــــ بچوں

کی بھی نہیں سنتا۔

گھر کے افرادیوں لیٹے ہوئے تھے جیسے سیپیوں نے اپنے بطن کا موتی کہیں گم کر دیا ہو اور اب چھلکوں کی طرح دھرتی پر گری پڑی ہوں ۔

گاؤں کا رواج تھا کہ جب کسی گھر کا کوئی فرد انتقال کر جاتا تھا تو اس گھر میں کچھ پکتا نہیں تھا ــــ گھر کی بہوؤں کے میکے والے اس دن کی روٹی بھیج دیتے تھے ۔ جسے کچھ کھانا ہوتا کھا لیتا ۔

دیپ کی چچی جب چوکے میں روٹی پروسنے کے لیے گئی تو اس کی نظر طاق پر پڑی۔

بہن کے ہاتھ کی پکی ہوئی دو روٹیاں ــ !"

ایک ہفتہ ہو گیا ہے جب بہن نے آخری بار تنور میں روٹیاں لگائی تھیں ۔ یہ دو روٹیاں بچ گئی تھیں ـــــ اٹھا کر طاق میں رکھ دی تھیں ۔ کہ صبح جانوروں کے آگے ڈال دوں گی ـــــ اس کے بعد کچھ ایسی بھگدڑ مچی کہ کسی کو کچھ ہوش نہ رہا ۔ یہ روٹیاں وہیں کی وہیں پڑی رہیں ـــــ سوکھ کر لکڑی ہو گئی ہیں ـــــ آدمی کہیں چلے جاتے ہیں مگر چیزیں پڑی رہتی ہیں "۔

جگدیپ نے چچی کی آواز سنی تو وہ طاق کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"میرے بیٹے کا چہرہ تو دیکھو کیسا اتر گیا ہے ـــــ آئیں تجھے روٹی پروس دوں"۔

چچی نے کہا اور تھالی میں روٹی ڈال دی ——چوکے میں دیپ کے لیے مونڈھا بچھا دیا۔

"میرے لال روٹی کیوں نہیں کھاتا——" چچی نے دیپ کو خاموش بیٹھا دیکھ کہا۔

"کھاؤں گا—— تو جا——"

چچی سب کے لیے تھالی میں روٹی ڈالتی رہی اور باہر دلان میں سب کے آگے رکھتی گئی۔

سب اپنے اپنے دھیان میں مگن تھے۔ دیپ نے سامنے رکھی ہوئی تھالی کو ابھی تک چھوا بھی نہیں تھا—— پھر دیپ نے دیکھا کہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا—— وہ چپکے سے اٹھا اور اس نے طاق میں سے دونوں روٹیاں اٹھا کر اپنے کرتے کے نیچے چھپالیں اور دلان سے گزر کر باہر کی گلی میں ہو لیا۔

گاؤں کے باہر بیری کا بہت بڑا پیڑ تھا۔ دیپ کو جیسے وہاں پہنچنے کی بہت جلدی تھی—— اس نے کرتے کے اوپر بازو رکھ کر ان دونوں روٹیوں کو مضبوطی سے اپنے سینے کے ساتھ لگایا ہوا تھا—— وہ بیری تلے پہنچ گیا۔

اس نے دونوں روٹیاں کرتے کے نیچے سے نکال لیں اور بیری کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا—— تاریکی بہت گہری تھی—— دیپ روٹیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں اسے روٹیوں پر پڑے ہوئے پھول بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر وہ دیکھتا رہا—— دیکھتا رہا——

پھر دیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے شام نہیں تھی دوپہر تھی اور وہ لڑکوں کے ساتھ مل کر بیری پہ سے بیر توڑ رہا تھا—— بیر توڑ توڑ کر اس نے لڑکوں کی جھولیاں بھر دیں——

اور بیر چُن چُن کر اس نے اپنی جھولی بھر لی ۔

ماں کی آواز سنائی دی ۔۔۔ "صبح کا گھر سے بھوکا پیاسا نکلا ہوا ہے ۔ میرا کنول کا پھول ۔۔۔ چہرہ کتنا مرجھا گیا ہے ۔۔۔ ماں تجھ پر نثار ہو جائے کیا تجھے روٹی نہیں کھانی تھی ۔۔۔ ؟" اس کے بعد ماں نے اس کو باقی لڑکوں سے الگ کر کے بیری کے نیچے بٹھا لیا ۔ اپنا دوپٹہ اتار کر اس کے سر پر ایک اوٹ سی کر دی اور اس اوٹ میں ماں نے مکھن سے چپڑی ہوئی روٹی اس کے آگے رکھ دی ۔

دیپے نے دانتوں سے روٹی توڑی ۔۔۔ روٹی مکھن کی طرح اس کے منہ میں گھل جایا کرتی تھی ۔ آج نہ جانے کیا ہوا تھا ۔ روٹی لکڑی کے ٹکڑے کی طرح اس کے منہ میں چبھنے لگی ۔

اوٹ کو ہاتھ سے پرے ہٹا کر دیپے نے ماں سے پوچھنا چاہا ۔

"میں ہوں دیپ ۔ ؟" نوراں کا دوپٹہ ڈھلک کر دیپ کے منہ پر آ پڑا تھا ۔

نوراں نے اپنا دوپٹہ کھینچتے ہوئے کہا :

"تو ۔۔۔ ؟"

"ہاں ۔۔۔ میں نوراں ہوں ۔۔۔"

"ماں کہاں ہے ؟"

". . . . . ."

نوراں خاموش رہی اور پھر بولی ۔

"تو رو رہا ہے ۔ ۔ ؟"

"نہیں تو ۔۔۔"

"روتو رہا ہے ـــــ"

"ماں کہاں ہے ـ؟"

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نوراں پھر خاموش رہی ـــــ

"تو کہاں سے آئی ہے ـ؟"

"میں نے تجھے ادھر آتے ہوئے دیکھا تھا ـــ تو اس قدر اندھیرے میں یہاں کیوں آیا ہے ـــ؟"

"یہاں ابھی ابھی ماں بھی آئی تھی ـــــ"

"یہاں ـــ؟"

"ہاں ۔ ۔ ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔اس لیے میرے سر پہ ادٹ کردی تھی ـــــ"

"تو پاگل ہوگیا ہے ذیب ـ"

"نہیں تو ـــــ"

"تیری جھولی میں یہ کیا ہے ـ؟"

"روٹی ـ"

"روٹی؟" نوراں نے ہاتھ لگا کر دیکھا ـــ واقعی لکڑی کے ٹکڑوں کی طرح سوکھی ہوئی وہ روٹیاں تھیں ـ

"انہیں کہاں سے لایا ہے ـــ؟"

"گھر سے ـــ چچی نے کہا تھا یہ روٹیاں ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی ہیں ـ"

"کیا تو نے آج روٹی نہیں کھائی ۔۔۔؟"

"ابھی ابھی ماں نے روٹی دی تھی ۔۔۔۔ کھانے ہی لگا تھا کہ ۔۔۔۔۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے ۔"

"نہیں تو ۔"

"ماں تو مر گئی ہے ۔"

"میں نے ابھی ماں کو دیکھا تھا ۔۔"

"یہ تیرا وہم ہے دیپ ۔۔۔ یہاں تیری ماں تیرے سر پر اوٹ کر کے تجھے روٹی کھلایا کرتی تھی نا ۔؟"

دیپ نے پھر کچھ نہ کہا ۔

"تو نے آج روٹی نہیں کھائی ہے نا ۔؟"

دیپ خاموش رہا ۔

"مجھے معلوم ہے تو نے کچھ نہیں کھایا ۔۔۔" اور پھر نوراں نے جھجکتے ہوئے کہا ۔۔۔ "تو میرے ہاتھ سے روٹی کھا لے گا ۔۔۔؟ ہمارے گھر کی روٹی ۔۔۔" اور نوراں نے اپنی چنری میں لپٹی ہوئی نرم روٹی نکال لی ۔۔۔ "ماں کیسٹے پر ایندھن ٹٹول رہی تھی ۔ میں چپکے سے روٹی نکال کر لے آئی ہوں ۔"

جگدیپ ابھی تک بیری کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا ۔۔۔ اس نے منہ اٹھا کر نوراں کی طرف پہلی بار دیکھا ۔۔۔

"تو رو رہا ہے ۔۔۔" اندھیرے میں بھی نوراں کو دیپ کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ نظر آ گیا اور وہ دیپ کے قریب بیٹھ گئی ۔۔۔ پھر اس نے اپنی چنری سے دیپ

کا منہ پونچھا۔

"تھوڑی سی روٹی کھالے۔"

دیپ نے نوالہ توڑ کر منہ میں ڈال لیا۔

"کسی کو بتانا نہیں ورنہ تم بھی پٹو گے میں بھی پٹوں گی۔؟"

"کیوں۔؟"

"ہم مسلمان جو ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا۔؟"

"کہتے ہیں خدا ناراض ہو جاتا ہے۔"

"خدا کوئی چیز نہیں۔" دیپ نے دوسرا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔

"یوں نہیں کہا کرتے۔"

"کیوں۔؟"

"خدا ناراض ہو جاتا ہے۔"

"ہونا ہے تو ہو جائے۔"

"پگلے یوں نہیں کہا کرتے۔"

"میں جانتا ہوں خدا کوئی چیز نہیں۔"

"تجھے کس طرح پتہ ہے۔؟"

"اگر خدا ہوتا تو میری بات نہ سنتا۔"

"تو نے اس سے کیا کہا تھا۔؟"

"میں نے اسے کہا تھا کہ میری ماں کو مرنے نہ دیتا۔"

"کیا کبھی تو نے اسے دیکھا تھا ۔۔۔؟ وہ دکھائی تھوڑے ہی دیتا ہے۔"

"کیا وہ سنتا بھی نہیں ہے۔"

"کیا خبر ۔۔۔؟"

اس کے بعد وہ دونوں چپ ہو گئے ۔۔۔ ایک ایک نوالہ کر کے دیپ نوراں کی لائی ہوئی ساری روٹی کھا گیا۔

"ان روٹیوں کو کیا کرے گا ۔۔۔؟ نوراں نے دیپ کی جھولی میں پڑی ہوئی دو سوکھی روٹیاں اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"کھاؤں گا۔"

"یہ نہیں کھائی جائیں گی ۔۔۔"

"ان کو چورا کر کے کھا لوں گا ۔۔۔"

"نہیں دیپ ۔۔۔"

"پھر کیا کریں ۔۔۔؟"

"انہیں بو دیں ۔۔۔" نوراں نے سوچنے کے بعد کہا۔

"کیا روٹیاں بھی کبھی اگا کرتی ہیں نوراں ۔۔۔؟"

"روٹیاں تو نہیں اگا کرتیں۔ لیکن ہم ان کے ساتھ بیروں کا بیج ڈال دیں گے یا آم کی گٹھلی ۔۔۔ بیروں یا آموں میں روٹیوں کا رس شامل ہو جائے گا۔"

"بات تو ٹھیک ہے نوراں ۔۔۔" دیپ جیسے اچھل پڑا اور پھر کہنے لگا۔

"چل اٹھ پھر ان کو بو دیں ۔۔۔"

"اس وقت کس طرح بوئیں گے ۔۔۔!"

"ایک گڑھا کھود لیتے ہیں ۔"

"کھرپا تو ہے ہی نہیں ۔"

"میں اپنے ہاتھوں سے گڑھا کھود دوں گی ۔"

"اپنے پاس تو بیج بھی تو نہیں ہے ۔ آم کبھی کوئی نہیں ۔"

"برگد کی ٹہنی توڑ کر لگا لیتے ہیں ۔"

"اس کا پھل کیسے کھائیں گے ۔ ؟"

"نہ سہی ۔ یہ پیڑ بڑا ہو جائے گا تو اس کے نیچے گھنی چھاؤں ہو جائے گی ۔"

"اچھا ۔"

"چل اُٹھ گڑھا کھود یں ۔"

"ہاں چل ۔ برسات شروع ہونے والی ہے ۔ پرسوں ماں کہہ رہی تھی برکھا رت میں بیج ڈالا جائے تو بہت جلد اگتا ہے ۔ !"

"کون سی جگہ اچھی ہے نوراں ۔ ؟"

"جو جگہ تجھے پسند ہو ۔"

"نہیں جو تجھے پسند ہو ۔"

"دھرم شالہ کے پیچھے بہت سی جگہ خالی پڑی ہے ۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گا ۔ !"

"کیوں ۔ ؟"

"وہاں لوگ بھگوان کا نام لیتے ہیں ۔"

"پھر کیا ہوا ۔ ؟"

"میں اس کا نام نہیں سننا چاہتا۔"

"پھر تو ہی بتا بیج کہاں ڈالیں۔"

"تیرے گھر کے پیچھے بھی تو بہت سی جگہ خالی پڑی ہے۔"

"ہاں ہے تو ۔۔۔"

"چل ۔۔ وہاں چلیں۔"

"چل ۔۔۔ میں روز پانی دے کر اسے سینچا بھی کروں گی۔"

جگدیپ نے برگد کے پیڑ سے وہ شاخ توڑی جس کی گانٹھیں پھوٹ نکلی تھیں نوراں نے دونوں روٹیاں اٹھالیں اور جب وہ دونوں نوراں کے گھر کے پچھواڑے پہنچے تو نوراں نے کہا ۔۔۔ "تو یہیں کھڑا رہ ۔۔۔ میں چھپ کر گھر سے کھرپا اور پانی ڈول لاتی ہوں ۔۔۔"

برگد کے نیچے سے پرلے تیسرے، نوراں نے گیارھویں اور جگدیپ نے تیرھویں برس میں قدم رکھدیا تھا۔

ایک دن دیپ کی چچی سوت اٹیر رہی تھی۔ لوہے کی دو سلائیوں میں ٹنگے ہوئے دو گوے پیتل کی چھلنی میں گیند کی طرح لڑھک رہے تھے اور دونوں کی ڈوری اٹیرن پر لپیٹتے ہوئے چچی نے ایک طویل گیت چھیڑ دیا تھا:

کالے کوّے اڑتا جا،
ڈال ڈال پہ بیٹھتا جا،
اُڑ جا میرے میکے جا،
اک نہ بتانا ماں رانی کو
دیکھ دیکھ گڑیاں روئے گی
اک نہ بتانا میرے پتا کو
چھوڑ کچہری آجائے گا،
اور چپکے چپکے روئے گا،
اک نہ بتانا میری بہن کو

چرخہ چھوڑ کے اُٹھ آئے گی

بلک بلک کر روئے گی،

اور پھر گیت گاتے ہوئے چچی کا گلا بھر آیا۔ سامنے دیپ اور اس کا اپنا بیٹا ہیرا اسکول سے لوٹ کر اپنے اپنے بستے رکھ رہے تھے۔

"دیپا۔!"

"کیا ہے چچی ۔؟"

"روٹی پروس دوں ؟"

"پروس دے چچی !"

جب چچی نے دونوں لڑکوں کے لیے تھالیوں میں روٹی رکھ دی۔ تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"کیوں چچی کیا تیری طبیعت اچھی نہیں ہے ؟"

"اچھی ہے دیپ "

"نہیں چچی ... کوئی بات ضرور ہے"

چچی سسکیاں بھرنے لگی اور دیپ نے روٹی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"تو روٹی کھالے پھر بتاؤں گی"

"نہیں چچی پہلے بتائے گی تو روٹی کھاؤں گا"

"نہیں تو پہلے کھالے گا تو پھر بتاؤں گی"

دیپ نے چچی کا کہنا مان لیا اور روٹی کھالی۔

"اب بتاؤ چچی کیا بات ہے۔؟"

چچی ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اسے اپنی گود میں بٹھا کر بولی۔
"تیرا ماموں پچھلے ایک برس سے یہ واسطے دے رہا ہے کہ تو اس کے پاس شہر جا کر پڑھے۔

"ہاں —"

"یہاں تو تین کوس کی مسافت طے کر کے اسکول جاتا ہے — دھوپ میں لوٹتا ہے تو تیرا چہرہ مرجھا جاتا ہے — اب تو کون سی جماعت میں ہے — ؟"

"نویں جماعت میں چچی ۔"

"تو لاہور جا کر کیوں نہیں پڑھتا کہتے ہیں بہت بڑا شہر ہے — مجھے تو میرے بھائی نے کئی بار وہاں بلوا بھیجا مگر میں نہ جا سکی — شاید میں بھی کبھی تیرے بہانے وہاں جا نکلوں ۔"

"اگر تو کہتی ہے چچی تو میں شہر چلا جاتا ہوں — یہ کہہ کر دیپا چچی سے لپٹ گیا — "میں شہر میں چچی سے کیسے ملوں گا۔ مجھے چچی کی طرح روٹی کون کھلائے گا؟"

"مجھے موت آجائے — چچی کے اندر بیٹھی ہوئی جیسے ماں بول رہی تھی ۔" تو میرے ہاتھ کی پکی ہوئی کب تک کھائے گا — ؟"

کیوں چچی — ؟

"سنا ہے —" چچی سے کچھ کہا نہ گیا۔

"کیا سنا ہے چچی — ؟"

"سنا ہے تیرے پتا . . . تیری نئی اماں آجائے گی دیپ —!"

"نئی ماں — ؟" دیپ بھی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا — اب وہ سمجھدار ہو گیا تھا۔

"دونوں بھائی الگ ہو رہے ہیں دیپ —— تیرے پتا کی رسوئی الگ اور ہماری الگ ——"

دیپ خاموش رہا۔

"ممانی بھی تو ماں کی طرح ہوتی ہے —— اگر تو شہر جا کر پڑھے گا۔ تو آدمی بن جائیگا —— ان دیہات میں تو آدمی مٹی سے لڑتا ہے اور مٹی ہو جاتا ہے۔"

"بہت اچھا چچی ——"

"ایک بات اور بھی ہے ۔"

"وہ کیا ——؟"

"تیری ماں کے کپڑے میں کسی کو نہیں دوں گی —— وہ میری بہن کے کپڑے ہیں ——!"

دیپ خاموش رہا ۔

"کتنے چاؤ سے اس نے ریشمی اور طلے دار کپڑوں کا ٹرنک بھرا ہوا تھا —— کوئی گوٹے والا —— کوئی طلے والا —— دوپٹہ تو ستاروں سے جڑا ہوا ہے —— کہا کرتی تھی —— میں نے دوپٹہ دیپ کی دلہن کے لیے رکھا ہوا ہے —— جھل مل کرتی ہوئی میرے دیپ کی بہو —— تیرے پتا ایک چھوڑ کر سات عورتیں لے آئیں۔ میں کسی کلموہی کو ہاتھ تک نہیں لگانے دوں گی —— تیرے چچا سے کہہ کر صندوق کی چابی میں نے اپنے پاس رکھ لی ہے —— یہ رہی وہ چابی —— اسے سنبھال کر رکھ لے دیپ!"

"میں اسے کیا کروں گا چچی ۔ تم ہی رکھ لے ۔"

"یہ تیری امانت ہے دیپ ۔" اتنا کہہ کر چچی نے اس کی پیشانی چوم لی ——

اسی رات کو دیپ کے چچا نے اپنے بھائی سے بات کر کے لاہور میں دیپ کے ماموں کو خط

لکھ دیا۔ دیپ نے اپنے کپڑے اور اپنی کتابیں حفاظت سے رکھ دیں اور اس کے والد نے اسے دو نئی قمیضیں اور دو نئے پاجامے سلوا دیئے۔

دوسرے دن رات کو دیپ نے ایک خواب دیکھا ـــــ اس نے اور نوراں نے مل کر برگد کا جو پیڑ لگایا تھا۔ اب وہ بلند قامت ہو گیا تھا۔ اس کے پتے نرم اور گھنے تھے ـــ اس کے چھتنارے میں کہیں بھی کوئی خلاء نہیں تھا۔

دیپ برگد کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اور پھر چھم چھما چھم کرتے ہوئے کسی کے قدموں کی آواز آنے لگی ـــــ دیپ نے چونک کر دیکھا۔

ایک پری اس کے سامنے کھڑی تھی ـــــ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں ـــ پری نے سلمے ستارے سے جڑا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تجھے سانپ سونگھ جائے ـــــ کیا تو نوراں ہے ـ؟"

"کیا تو ڈر گیا تھا دیپ ـ؟"

"ہاں ـــ تو پری بن کر کیوں آئی تھی ـ؟"

"میری مرضی۔"

نوراں کی ہنسی سے دیپ کی آنکھ کھل گئی ـــ اور دیپ نے دیکھا نہ وہاں برگد کا پیڑ تھا، نہ نوراں اور نہ ہی وہاں تاروں جڑا لباس تھا ـــــ وہ دالان میں اپنی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔

شام کو دیکھو نوراں کے گھر گیا۔ چچی بیگماں سے ملا۔ نوراں سے ملا۔ اور پھر وہ دونوں بالٹی میں پانی ڈال کر اپنے برگد کو پانی دینے لگے۔

"تو شہر کیوں جا رہا ہے دیپ ـ؟"

"وہاں پڑھوں گا۔"

"تو بہت پڑھ جائے گا دیپ تو ہم سے بات بھی نہیں کرے گا۔"

"کیوں ۔؟"

"تجھے ہماری باتیں پسند نہیں آئیں گی ۔۔۔" نوراں نے ابرق لگا کر اپنا دوپٹہ رنگا ہوا تھا ۔۔۔ دیپ نے اس کا دوپٹہ مروڑ کر بہت سا ابرق جھاڑ دیا ۔۔۔!

"نوراں ۔؟"

"میرے دوپٹے کا سارا ابرق اتار دیا تو نے ۔۔۔"

"میں نے سوچا تھا کہ تیرے دوپٹے میں تارے جڑے ہوتے ہیں۔"

"ہاں تجھے دن کو بھی تارے دکھائی دیتے ہیں۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے ۔

"کیا تو برگد کو یونہی سینچتی رہے گی ۔؟"

"تجھے کیا ۔ سینچوں یا نہ سینچوں ۔؟"

"اچھا ۔ میری بلا سے ۔۔"

"تو شہر جا ۔۔ تجھے گاؤں کے برگد سے کیا واسطہ ۔۔۔ یہ سوکھ جائے یا جل جائے ۔ تجھے اس سے کیا غرض ۔ ؟"

نوراں کے معصوم ہونٹوں پر یہ جوانی کا پہلا طعنہ تھا ۔

دوسرے دن صبح کو دیپ اپنے ماموں کے ساتھ شہر چلا گیا ۔

جگدیپ کو اس کے ماموں نے نویں جماعت میں داخل کروا دیا۔ اسکول میں پہلا دن عمر بھر کے لیے اس کے دل پر ایک گہری خراش ڈال گیا۔

اس کی جماعت کے لڑکے آپس میں کھسر پھسر کرتے، جگدیپ کی طرف دیکھتے اور پھر قہقہے سر کرتے ــــ لڑکوں کی نگاہیں جگدیپ کو اپنے چہرے پر کانٹوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں ــــ دو تین گھنٹے گزر گئے جگدیپ کے دل میں یہ خواہش کسمسا رہی تھی کہ وہ اسکول سے بھاگ جائے، شہر سے بھاگ جائے اور کہیں دور نکل جائے۔

ڈرائنگ کے پیریڈ میں جب آدھ گھنٹہ صرف کرکے اُن لڑکوں نے اپنی اپنی کاپیاں ماسٹر کے حوالے کیں تو ماسٹر جی نے کاپیاں دیکھ دیکھ کر جگدیپ کی کاپی الگ رکھ لی ــــ اور پھر جگدیپ کو اپنے پاس بلا کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دی ــــ لڑکوں نے ہونٹوں پر آئی ہوئی ہنسی دبا کر رہ گئی ــــ صبح سے جگدیپ کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

ڈرائنگ کا پیریڈ ختم ہو گیا ــــ لڑکے کمرے سے باہر آئے تو پھر کھسر پھسر شروع ہو گئی اور جگدیپ کو ایک بار پھر لڑکوں کی نگاہیں اپنے چہرے پہ کانٹوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

دوسرے دن ڈرائنگ کے پیریڈ میں ماسٹر جی نے جگدیپ کی کاپی بورڈ پر لٹکا دی اور لڑکوں کو دکھلائی ـــــ لڑکوں کی ہنسی کل کی طرح ایک لمحہ کے لیے پھر دب گئی ـــــ جگدیپ نے پھر اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اب بھی اس کا دل بجھا ہوا تھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ تنہائی میں بیٹھ کر

ڈرائنگ کا پیریڈ ختم ہوا تو لڑکے پھر قہقہے چھوڑنے لگے۔

جگدیپ روہانسا سا ہو کر بورڈ کے اوپر سے اپنی کاپی اتارنے لگا۔

لڑکے کمرے سے باہر جا چکے تھے ـــــ ماسٹر جی نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔

"تمہارے ہاتھ میں بڑی صفائی ہے ـــــ اگر میں تمہیں بہت سا کام کرنے کے لیے دوں تو کیا کرو گے ـــ؟"

جگدیپ نے کچھ نہ کہا ـــــ ماسٹر جی کے ان الفاظ نے اس کے درد کو اور بھی چمکا دیا تھا۔

"اگر تم محنت کرو گے تو کسی روز مصوّر بن جاؤ گے۔"

جگدیپ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا ـــــ اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی ـــــ اس شہر میں سب ہی بیگانے تھے وہ بھول کر اس شہر میں آ گیا تھا ـــــ لوگ اسے دیکھ کر ہنستے تھے ـــــ صرف ماسٹر ہی ایک ایسا تھا جو اس پر ہنس نہیں رہا تھا۔

ماسٹر جی نے اس کی دلی کیفیت کو بھانپ لیا اور پھر بڑے پیار سے اسے اپنے پاس اسٹول پر بٹھا کر پوچھا ـــــ "شہر میں تمہارا شاید جی نہیں لگا ـــ؟"

"میں اس اسکول میں نہیں پڑھوں گا ـــــ جگدیپ کے ہونٹ پھڑپھڑانے

لگے ـــــ "مجھ پر دوسرے لڑکے ہنستے ہیں "

"اچھا ـــــ میں تمہیں ایک بات بتاؤں ـــــ کل سے سفید پاجامہ پہن کر آنا ـــــ یہ دھاری دار پاجامہ نہ پہننا "

اب بھی جگدیپ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ـــــ وہ اپنے پاجامے کی طرف دیکھنے لگا ـــــ نیا اور کورا پاجامہ تھا ۔

"شہروں میں دھاری دار پاجامہ صرف رات کو سونے سے پہلے پہنتے ہیں ، دن کو نہیں پہنتے ـــــ یہی وجہ ہے کہ لڑکے تمہیں دیکھ کر ہنستے ہیں ـــــ تمہارا کام سب سے اچھا ہے ـــــ تم جماعت میں اول آؤ گے ـــــ پھر دیکھنا "

جگدیپ کے بجھے ہوئے دل میں ایک چنگاری سی سلگ اٹھی ـــــ اس سے کچھ نہ کہا گیا ۔ لیکن جب اس نے ماسٹر جی کی طرف دیکھا تو اس آنکھوں میں اس عہد و پیماں کی جھلک تھی ـــــ "جتنی محنت آپ کہیں گے میں کروں گا ۔

ڈیڑھ برس بیت گیا ــــ جگدیپ نے دسویں جماعت پاس کرلی۔ اور جب اس کے ماموں نے اسے کالج بھیجنا چاہا تو جگدیپ نے فیصلہ کن انداز میں کہا کہ وہ آرٹ سکول میں داخل ہوگا۔

ماموں کا جی چاہتا تھا کہ ان کے خاندان میں کوئی لڑکا بی اے پاس ہو۔ اسے جگدیپ سے بڑی امیدیں تھیں لیکن جگدیپ کے ارادے نے اس کے حوصلے پست کر دیئے گاؤں سے جگدیپ کے والد کا خط بھی آیا کہ تصویریں بنانا سیکھ کر جگدیپ کے پلے کیا پڑے گا ــــ کالج میں پڑھے ــــ شاید کبھی افسر بن جائے ــــ ورنہ گاؤں واپس چلا آئے ــــ اپنی زمین پر کام کرے۔

جگدیپ کے پاس امید کی صرف ایک ہی کرن تھی ــــ اسکول کا وہ ڈرائنگ ماسٹر ــــ!

اس کے پاس جا کر جگدیپ نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور اس سے التجا کی کہ وہ اس کے ماموں کو سمجھائے۔

تین دن کی مسلسل بحث اور تکرار کے بعد ماموں بددل ہو کر جگدیپ کو آرٹ اسکول میں لے گیا۔

"لو یہ گولڈ سمتھی ہے سنار کا کام! یہ بلیک سمتھی ہے۔ لوہار کا کام۔! یہ کارپنٹری ہے ــــ بڑھئی کا کام ــــ یہ ہے ٹیکسٹائل ڈیزائن ــــ جیسے ہمارے گاؤں میں کپڑے پر چھاپے کا کام ــــ اس کا ماموں کہہ رہا تھا۔ جگدیپ مسکرا رہا تھا ــــ ماموں نے مجسمہ سازی کے شعبے کی طرف جا کر کہا ــــ" جیسے کمہار برتن بناتا ہو ــــ دیپ اگر اتنے برس ضائع کر کے تجھے لوہار یا بڑھئی ہی بننا ہے تو۔۔۔۔"

"آپ فکر نہ کریں ــــ میں کمرشل پینٹنگ کا کورس ــــ کروں گا"

"بعد میں لوگوں کے سائن بورڈ ہی بنایا کرے گا۔؟"

اس کا ماموں مایوس ہو چکا تھا ــــ جگدیپ خاموش رہا ــــ اور اس نے کمرشل پینٹنگ کے شعبے میں اپنا نام لکھوا دیا۔

گاؤں سے جگدیپ کے والد کے دو تین خطوط آئے۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اب ان کی صحت گرتی جا رہی ہے اور جگدیپ چھٹیوں میں آکر ان سے مل جائے چچا کا خط بھی آیا تھا — اس خط میں اس کی چچی نے لکھوایا تھا — "کیا تو اتنا ہی سنگدل ہو گیا ہے — کبھی آکر منہ نہیں دکھایا"

گذشتہ چھٹیوں میں بھی اس نے سوچا تھا کہ وہ گاؤں جائے گا۔ کئی بار اس نے ارادہ بھی کیا۔ لیکن جب بھی وہ اپنے ٹرنک میں کپڑے ڈالتا تو اس کے دل کو ایک ٹیس اٹھتی — اس نے سنا تھا کہ اب اس کے گھر کے دالان میں ایک اونچی دیوار اٹھا دی گئی تھی — ایک طرف چچی رہتی تھی۔ اور دوسری طرف اس کی نئی ماں ! لوگ کہتے تھے کہ اس کا والد دھرم شالہ میں پھیرے لیکر ایک عورت گھر لے آیا تھا جسے سب چھوٹی شاہنی کہتے تھے۔

جگدیپ جب گاڑی میں سوار ہوا تو بڑی دیر تک اسے اپنے گھر کے دلان میں اٹھی ہوئی دیوار دکھائی دیتی رہی — پھر اس دیوار کی جگہ برگد کے پیڑ لہلہانے لگے — ریل گاڑی اسے گاؤں کے قریب لیے جا رہی تھی۔

اس نے والد کے قدموں میں سر رکھ دیا — چچا سے بغلگیر ہوا اور پھر چچی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"تو اب جوان ہو گیا ہے — !"

"اور تو بہت دُبلی ہوگئی ہے چچی ۔۔۔؟"

"یہ میری جوانی کے دن تو نہیں ہیں ۔۔۔"

"ہیرا کہاں ہے ۔؟"

"ابھی کنوئیں سے آتا ہوگا ۔۔۔ اس نے بڑا قد نکال لیا ہے ۔۔۔ تیرے کندھے کے برابر آتا ہے۔"

"اور چچی ۔ ۔ ۔ ۔"

"آ تجھے چھوٹی شاہنی کے پاس لے چلوں ۔۔۔ باہر نہیں نکلتی ۔۔۔ تجھ سے ڈرتی ہے۔"

"مجھ سے ۔؟"

"ہاں ۔۔۔ غریب گھر کی لڑکی ہے ۔۔۔ ڈری ڈری سی رہتی ہے۔"

جگدیپ کے سینے پر پڑا ہوا بوجھ جیسے چچی نے ہلکا کر دیا ۔۔۔ اس نے اندر جاکر چھوٹی شاہنی کے پاؤں چھوئے۔

"جیتے رہو ۔۔۔" اور چھوٹی شاہنی نے جھجکتے ہوئے جگدیپ کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا ۔۔۔ "کیا تم مجھ سے ناراض ہو ۔۔۔؟" چھوٹی شاہنی نے دھیمی آواز سے پوچھا۔

"نہیں تو ۔۔۔" دیپ جیسے چونک پڑا۔

"تم گاؤں کیوں نہیں آتے تھے ۔۔۔؟"

"سوچ رہا تھا کہ کچھ پڑھ لوں ۔۔۔ کچھ سیکھ لوں ۔۔۔" دیپ نے کہا۔ مگر وہ حیران تھا اسے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی۔

"ہیرا کو کوئی قصور نہیں دیپ ۔۔۔" چھوٹی شاہنی نے پھر آہستہ سے کہا۔!

"نہیں تو ۔۔۔" جگدیپ نے ایک بار پھر حیران ہو کر چھوٹی شاہنی کی طرف دیکھا۔ گزشتہ برس جگدیپ چھوٹی سیٹھانی سے ملنے سے ڈرتا رہا تھا۔ لیکن آج اس نے

دیکھا کہ چھوٹی شاہنی شاید اس سے بھی زیادہ ڈرتی تھی۔

جگدیپ نے کھانا کھایا اور پھر دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد اس نے کہا:

"میں ذرا باہر ہو آؤں"

"ابھی تو بہت دھوپ ہے ـــ تھوڑی دیر بعد جانا ـــ" نئی شاہنی نے پیار سے کہا ـــ اگر اس کی ماں ہوتی تو وہ شاید اس کا کہا ٹال دیتا لیکن چھوٹی شاہنی کے سامنے اس سے انکار نہ ہوا اور وہ چارپائی پر لیٹا رہا۔

"مجھے یاد ہی نہیں رہا ـــ نوراں دو بار آچکی ہے ـــ تم سوئے پڑے تھے!"

"نوراں ـ؟"

"کیوں کیا یاد نہیں رہا ـــ کہتے ہیں بچپن میں تو اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔!"

"نوراں آئی تھی ـ؟"

"دو بار آچکی ہے ـ"

"مجھے جگا لیا ہوتا ـ"

"میں سمجھی ـــ تم تھکے ہوئے ہو ـــ اور وہ جھجکتی بھی بہت تھی ـــ اب تم جوان ہو گئے ہو نا ـ!

"اچھا میں ذرا چچی بیگماں کے گھر تک ہو آؤں ـــ" اور جگدیپ اٹھ بیٹھا۔

"چچی ـ چچی ـــ!" جگدیپ نے چچی بیگماں کے دروازے پر جا کر دستک دی۔

"خدا تجھے سلامت رکھے ـــ میں قربان جاؤں ـــ" بیگماں جیسے پھولی نہیں سما رہی تھی

"خیریت سے تو ہو چچی ـ؟"

"تجھے دیکھ کر بہت خوش ہوں ـــ ذرا ٹھہر ـــ میں چارپائی پر چادر بچھا دوں۔"

"کیا پہلے بھی تو چادر بچھایا کرتی تھی ـــ اب میں کوئی اور تو نہیں ہوں"

"اب خدا کے فضل سے نوجوان ہو گیا ہے ــــــ سنا ہے اب تو نہایت اچھی تصویریں بنا لیتا ہے "۔

"تیری تصویر بناؤں چچی ـــ؟"

"اب اس بڑھاپے میں میری کیا تصویر بنائے گا ـــ اب تو چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں ـــ"

"میں جھریاں بھی بنا دوں گا ـــــ" دیپا نے کھل کر ہنستے ہوئے کہا۔

"بتا میں تیری کیا خاطر و مدارات کروں ـــــ"

"گھر میں جو کچھ بھی پکا ہے کھلا دو"

"میرے گھر کی پکی ہوئی کوئی چیز تو بھلا کب کھائے گا "

"کبھی کھلا کر بھی دیکھا ہے چچی ـــ؟"

"میں اگر کھلاتی تو کیا کھا گیا ہوتا ـــ؟"

"کیوں نہ کھا گیا ہوتا ـــ تو نے کبھی کچھ کھلایا بھی ہے ــــ نوراں مجھے کھلایا کرتی تھی "

"جانے بھی دے "

بیگماں نے ابھی جانے بھی دے "کہا ہی تھا کہ دروازے کے پیچھے سے کسی کے کھلکھلانے کی آواز آئی۔

"وہ دیکھ ــــ دروازے کے پیچھے کھڑی قہقہہ لگا رہی ہے ـــ اری ذرا باہر تو نکل ـــ وہی دیپ تو ہے ـــ کوئی اور تو نہیں ــــ" اس کے بعد ماں نوراں کا بازو پکڑ کر اسے باہر لے آئی۔

"کوئی گھر آئے ــــ تو کیا اس طرح کیا کرتے ہیں ـ!"

"اچھے میں تیرے گھر نہیں گئی تھی"
"تونے مجھے جگایا کیوں نہیں۔؟"
"میں نے سوچا تو کہیں ناراض نہ ہو جائے"
"تجھ سے ناراض ہو جاتا۔؟"
"ناراض ہی تو تھا جب ہی تو گاؤں نہیں آتا تھا"
"کیا تو نے مجھے کبھی بلوا بھیجا تھا۔؟"
"کیوں نہیں۔"

اب دیپ کے پاس کوئی جواب نہ رہا ـــــ نوراں نے کبھی خط نہیں لکھا تھا۔ کبھی کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا۔ پھر بھی وہ یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ اس نے کبھی اس کو بلوا نہیں بھیجا تھا ـــــ دیپ نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا ـــــ مجھے تو نے کونسا خط لکھا تھا؟"

نوراں خاموش رہی لیکن اس نے کچھ اس انداز سے دیپ کی طرف دیکھا وہ شرمندہ ہو گیا۔

"کیا برگد کو پانی بھی دیا کرتی ہے۔؟"
"تجھے کیا۔؟"

دونوں ہنس پڑے جیسے صلح ہو گئی۔

"صبا آسے جا کر دیکھ ـــ دن میں دو بار پانی دیا کرتی تھی ـــ" ماں نے کہا اور پھر وہ دیپ کی طرف منہ کر کے بولی ـــ "جب میں اسے پانی کا گھڑا لانے کیلئے کہتی تو کانوں میں انگلیاں ڈال لیا کرتی تھی لیکن برگد پر دو دو گھڑے پانی کے انڈیل دیا کرتی تھی۔

نوراں اور دیپ جب برگد کے نیچے گئے تو دیپ نے برگد کے نرم پتے اپنے ہاتھ

میں لے کر کہا ـــــ تیرا برگد کتنا بڑا ہو گیا ہے "

"جیسے یہ برگد تیرا نہیں ہے "

دیپ نے آنکھیں بند کر لیں ـــــ ایک بار تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے برگد کی چھاؤں میں ماں کے ہاتھ کی چھاؤں ملی ہوئی تھی ـــــ وہ رات دیپ کی آنکھوں میں گھوم گئی جب وہ ماں کے ہاتھوں کی پکی ہوئی روٹیاں اپنی جھولی میں لیکر بیری کے نیچے بیٹھا ہوا تھا ـــــ ماں کے دوپٹے کی اوٹ ـــــ نوراں کی چنری ـــــ

اور پھر نوراں کی چنری میں ستارے جڑے گئے ـــــ دیپ نے چونک کر پوچھا ـــــ "نوراں اگر تو سر پر ستاروں والی چنری اوڑھ لے تو میں تیری ایک تصویر بناؤنگا"

"میرے پاس ستاروں والی کوئی چنریا نہیں ـــــ" نوراں نے دھیمے سے کہا ۔

جگدیپ کو ماں کا صندوق یاد آگیا ـــــ اور پھر چچی کے پاس رکھی ہوئی اس صندوق کی چابی یاد آئی ۔

"اگر میں وہ چنری لا دوں تو ـــــ"

"کہاں سے لائے گا ؟"

"ماں کے صندوق میں پڑی ہوئی ہے "

"وہ تو چھوٹی شاہنی نے لی ہوئی ـ ؟"

"نہیں چچی نے اسے سنبھال کر رکھا ہوا ہے "

"تو یوں ہی تصویر بنالے "

"نہیں نوراں ـــــ میں وہ چنریا لاؤں گا "

"کوئی دیکھ لے گا "

" تو ہمارے گھر آجا ـــــ اوپر کی منزل خالی پڑی ہے ـــــ وہاں کوئی بھی نہیں

دیکھ سکے گا ـــــ میرے رنگ اور برش بھی وہیں پڑے ہیں"۔

"بہت اچھا"

"کل سویرے آجانا"

اس رات کو دیپ نے چچی کے یہاں کھانا کھایا اور پھر چچا کے ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

" دنیا میں ماں کی جگہ تو کوئی بھی نہیں لے سکتا لیکن چھوٹی شاہنی دل کی بُری نہیں ہے دیپ -!"

"بُری تو نہیں "

" تیرے پتا نے تیرے چچا کے ہاتھ سندیسہ بھیجا ہے کہ تجھ سے کہا جائے چھوٹی شاہنی کی طرف سے اپنے دل میں کوئی میل نہ لانا"۔

"میرے دل میں تو کچھ بھی نہیں ہے چچی"۔

"میں جانتی ہوں دیپ ـــــ لیکن تیرے پتا ڈرتے تھے ـــــ لڑکا جوان ہو گیا ہے ـــــ کہیں دل میں کوئی گرہ نہ باندھ لے"۔

"اس بے چاری کا کیا قصور ہے، چچی"۔

"مگر عمر کا بہت فرق ہے دیپ ـــــ کوئی جوڑ نہیں ـــــ بھگوان کی کرپا سے سیٹھ جی کی عمر کافی ہے ـــــ تو بھی تو بڑھاپے کی اولاد ہے ـــــ اور نئی شاہنی

کی بھرپور جوانی ہے ۔۔۔ نہ کسی کے بھلے میں ۔۔۔ نہ کسی کے برے میں ۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے اس نے اپنا من مار لیا ہو۔"

"خوش نہیں رہتی ۔؟"

"خوش تو ہے ۔۔۔ بھرا پڑا گھر ہے ۔۔۔ غریب گھر کی لڑکی تھی ۔۔۔ اس کے باپ نے سیٹھ جی کے یہاں اپنی زمین رہن رکھی ہوئی تھی ۔۔۔ کہتے ہیں سیٹھ جی نے زمین بھی لوٹادی اور اس کے باپ کو کچھ نقد بھی دے دیا ۔۔۔

"مگر جوڑ کوئی نہیں ہے دیپ ۔!"

"ایک بات کہوں چچی ۔"

"کیا ۔۔۔"

"تیرے پاس صندوق کی چابی ہے نا ۔؟"

"میرے پاس تیری امانت پڑی ہے ۔"

"وہ کپڑے اس سے نکال دے ۔"

"نہیں دیپ ۔۔۔ وہ کپڑے تو جب بھگوان کی دیا سے دُلہا ۔۔۔"

"میری بات تو سن چچی ۔"

"تیری ماں کہا کرتی تھی ۔"

"اس وقت تک نوان کپڑوں کا رواج نہیں رہے گا "

"کیا تو بوڑھا ہو کر شادی کرے گا ۔؟"

"نہیں ۔۔۔ شہروں کی لڑکیاں اب ایسے کپڑے نہیں پہنتی ہیں ۔"

"کیا تو کسی شہر کی لڑکی سے شادی کرے گا ۔ ویسے تیری بات تو ٹھیک ہے

اب تجھے گاؤں کی لڑکیاں پسند نہیں آسکتیں ۔ کیوں دیپ ــــ؟ یہ جو تو نے پتلون پہن رکھی ہے تجھے بہت پھبتی ہے ــــ صاحب معلوم ہوتا ہے ۔

"اچھا تو چابی دے دو" ــــ دیپ ہنسنے لگا ۔

"اس میں ایک دوپٹہ ہے ــــ ستاروں والا ــــ ستارے یوں جڑے ہوئے ہیں کہ اس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے ۔"

"وہ دوپٹہ میں نکال لوں گا ۔"

"چاندی کی چھانجریں ہیں ــــ"

"وہ نکال لوں گا ۔"

چچی نے چابی لاکر اسے دیدی اور جگدیپ گھر جاکر عقبی کمرے میں وہ صندوق کھولنے لگا ۔ صندوق کو ہاتھ لگاتے ہی دیپ کے دل میں کوئی چٹکیاں لینے لگا ــــ ماں کے ہر ایک لمس کو جیسے اس نے اپنے گلے سے لگا رکھا تھا ــــ دیپ کپڑوں کی تہہ نہ ٹٹول سکا ــــ اس نے چچی کو بلا بھیجا اور چچی نے آکر ستاروں والا دوپٹہ اور چاندی کی چھانجریں نکال کر اوپر کی منزل میں دیپ کے ٹرنک میں رکھ دیں ۔ اور باقی صندوق جوں کا توں بھرا رہنے دیا ۔

دیپ نے چھوٹی شاہنی کو بلوایا اور چابی اس کے حوالے کر دی ۔

"رہنے دو دیپ ــــ گوٹے کناری والے کپڑے پہننے کی اب میری عمر کہاں ہے ۔"

دیپ نے حیران ہو کر چھوٹی شاہنی کی طرف دیکھا ــــ اس کی عمر بمشکل بیس برس کی تھی ۔ وہ زیادہ سے زیادہ بائیس برس کی ہوگی وہ کہہ رہی تھی کہ گوٹے کناری والے کپڑے پہننے کی اب عمر کہاں ہے ۔

"تیری عمر کیوں نہیں — تیرے کھانے پینے کا وقت ہے — لڑکے کی بات رکھ لے یہ صندوق وہ خوشی سے تجھے دے رہا ہے — پاس ہی کھڑی ہوئی چچی نے کہا اور چھوٹی شاہنی نے چابی لے لی۔

صبح جگدیپ ابھی سویا ہی پڑا تھا کہ نوراں آپہنچی — آج نوراں نے دیپ کو جگایا۔

"کیا شہروں میں لوگ صبح کو اتنی دیر کے بعد جاگتے ہیں —؟"

"تو ہے نوراں —؟"

"مجھ سے کہا تھا صبح سویرے آجانا —"

"صبح ہی تو ہے"

"میں واپس چلی جاتی ہوں — شہروں کی صبح شاید دوپہر کو ہوتی ہے"

"نہیں نوراں — یہاں بیٹھ جا — میں پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤں گا"

دیپ نے جب تیار ہو کر اپنے ٹرنک او ربرش نکالے تو ستاروں والا دوپٹہ بھی نکال لیا۔

"میں یہ دوپٹہ نہیں اوڑھوں گی —"

"کیوں —؟"

"اسے اوڑھ کر تو میں —" اس کے چہرے پر حجاب کی سرخی دوڑ گئی۔

"ذرا سی دیر کے لیے اوڑھ لوگی تو کیا ہو جائے گا۔؟"

"کچھ نہیں"

"تو پھر اوڑھ لو —"

کچھ لمحوں کے لیے دونوں خاموش رہے اور پھر نوراں نے دوپٹہ اپنے سر پر ڈال لیا۔
آج سے کئی برس پہلے دیپ نے جو خواب دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں لرزنے لگا۔

ردیپ نے جب اپنے برش کو رنگ میں ڈبو یا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا ۔
تصویر بنانے کے لیے

"کیوں ـــــ بنا تو رہا ہوں "

"دوپٹہ کی طرف دیکھتا چلا جا رہا ہے اور تصویر تو نہیں بنا رہا ہے "
"نہیں نوراں ـــــ تارے اتنے چمک رہے ہیں کہ میری آنکھیں چندھیائی جا رہی ہیں "

" دوپٹہ اتار دوں ـــ ؟"

"نہیں ـــــ نہیں ـــ یونہی بیٹھی رہ ـــ"

دیپ نے جیسے تیسے تصویر تو بنائی مگر اسے اطمینان نہ ہوا ـــــ وہ جانتا تھا کہ ابھی
ں کے فن میں پختگی نہیں آئی ـــــ نوراں نے دوپٹہ اتار کر اسے تہہ کیا اور پھر اسے
یپ کے ٹرنک میں رکھ دیا ۔

"یہ دوپٹہ تو لے جا نوراں ـــــ تجھے بہت بھلا لگتا ہے "

"ہٹ ـــــ" اور نوراں بھاگ گئی ۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں اور جس روز دیپ کو شہر واپس جانا تھا ۔ چچی بیگماں نے اس کے
ں آکر کہا ـــــ "چھ مہینے تک نوراں کی شادی کرنی ہے ـــــ خط لکھوں تو آئے گا ـ ؟

"نوراں جائے گی تو ضرور آؤں گا "

جگدیپ سب سے رخصت ہو کر گاڑی پر سوار ہوا تو اس رات کو گاڑی میں سوتے
ئے اس نے ایک سپنا دیکھا کہ کوئی اس کے ٹرنک میں سے تاروں والا دوپٹہ نکال
اس کے تارے ادھیڑ رہا تھا ۔

ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ نوراں کی شادی کی اطلاع موصول ہوئی۔ اس نے شہر کے تمام بازار کھنگال ڈالے مگر نوراں کو تحفہ دینے کے لیے جگدیپ کی نظر پر کوئی چیز نہیں چڑھتی تھی۔ جگدیپ اپنے ہاتھ سے کئی بار اسے دو رہٹا تا لیکن گھوم پھر کے تاروں والا دوپٹہ اس کی آنکھوں کے آگے آجاتا ــــ وہ لینے پر جھنجھلا اٹھا اور پھر اس نے گاؤں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مہینوں کی ایک لمبی قطار گذر گئی ــــ جگدیپ نے کمرشل آرٹ کے کورس کے تین سال پورے کر لیے اور فائن آرٹس کا دو سال کا کورس شروع کر دیا اب اس کے رنگوں سے زندگی جھلکنے لگی تھی۔

اس کے بعد یہ خبر آئی کہ سیٹھ جی کا انتقال ہو گیا ــــ ویسے بیمار چلے آرہے تھے۔ اسی لیے ان کی موت سے پہلے کسی نے جگدیپ کو کوئی خاص بات نہیں لکھی تھی ــــ کسی کو یہ توقع بھی نہیں تھی ــــ جس رات کو انہوں نے وفات پائی اس دن صبح کو اچھے بھلے تھے ــــ باہر کھیتوں میں بھی گئے تھے ــــ دوپہر کو انہوں نے کچھ نہ کھایا۔ کہنے لگے ہاتھ پاؤں ٹوٹ رہے ہیں اور دل ڈوب رہا ہے۔

جگدیپ کو ان کے انتقال کے متعلق تار ملا اور وہ اسی رات کو گاڑی پر سوار ہو گیا۔

تیرے سامنے — ہم بہت شرمندہ ہیں دیپ — موت نے ہمیں ایک دن کی بھی فرصت نہ دی کہ ہم تجھے مطلع کرتے —"، جگدیپ کو اپنے گلے سے لگا کر چچی خوب روئی۔

جگدیپ نے چھوٹی شاہنی کی طرف دیکھا — اسکا اُترا ہوا چہرہ اور بھی اتر گیا تھا۔

جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کا سونا پن گہرا — اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔

جگدیپ کو کم از کم تیرہ دن کے لیے گاؤں میں رہنا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ لہذا جگدیپ شہر واپس نہ گیا۔

جگدیپ کے ساتھی لڑکے اب گاؤں کے سجیلے جوان بنے ہوئے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان میں جا بیٹھتا لیکن اس کی کسی کے ساتھ گاڑھی نہیں چھنتی تھی۔ لیکن وہ کنوؤں پر بیٹھے۔ کھیتوں میں کام کرتے اور ہنستے گاتے ہوئے اسے اچھے لگتے تھے — اس نے کئی خاکے بنائے لیکن ہر ایک شام کو وہ سوچتا تھا کہ آنے والی کل کے دامن میں بھی اس کے لیے کوئی دعوت نہیں ہے۔

چچی بیگماں کے گھر بھی وہ تین بار گیا تھا — نوراں اپنے سسرال میں تھی۔ اور چچی اسے بڑے فخر کے ساتھ بتاتی رہی کہ کیسے اس نے نوراں کے لیے گہنے بنوائے کیسے اس نے اپنی شادی کے جوڑوں پر کشیدہ کاڑھا۔ ایک نوراں پر ایک نیا روپ آیا، کیسے بارات آئی، کتنا اس کا زیور آیا اور ان کے گھر کتنی دیگیں چڑھائی گئیں۔

جگدیپ بیگماں کے گھر کے پچھواڑے بھی جاتا رہا — اپنے برگد کو دیکھتا رہا۔ نوراں نے سینچ سینچ کر اسے پالا تھا اور اب وہ اس قدر جوان ہو گیا تھا کہ پانی کا محتاج رہا تھا — اس کے پتوں نے ایک چھت بنا دی تھی — جگدیپ اس کی چھاؤں تلے اپنے کاغذوں اور رنگوں کو ادھر اُدھر بکھیر دیتا — ان کے کانوں میں کبھی کبھی آواز آتی —

"تو برگد کو سینچا کرے گی۔ نا نوراں —؟"

"تجھے کیا — سینچوں یا نہ سینچوں۔"

"چلو مجھے کچھ بھی نہ سہی۔"

"تو شہر جا — تجھے گاؤں کے برگد سے کیا واسطہ — سوکھ جائے یا جل جائے تجھے اس سے کیا غرض۔!"

اور پھر اس کے جی میں آتا وہ کہے — "تو نے الٹی بات کہی تھی لوراں — گاؤں کے برگد سے تجھے کیا واسطہ — چاہیئے یہاں کو روز آ کر بیٹھا رہے ۔ ۔ ۔ ۔" اس کے بعد "تجھے کیا واسطہ" کا جملہ جگدیپ کے دل میں ایک ہلچل پیدا کر دیتا۔

چھٹیاں ابھی اب ختم ہونے والی تھیں — ایک روز جگدیپ کے آگے روٹی رکھتے ہوئے چھوٹی شاہنی کا گلا بھر آیا — "تو شہر چلا جائے گا دیپ۔!"

"شہر — ہاں جانا ہی پڑے گا۔"

"تو اب شادی کیوں نہیں کر لیتا۔"

"پھر کیا ہوگا — جگدیپ ہنس پڑا۔

"نہیں — بات یہ ہے کہ —" چھوٹی شاہنی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی خاموشی میں کچھ ایسا درد تھا کہ جگدیپ کی ہنسی اس کے ہونٹوں پر جم گئی۔

"کیا بات ہے چھوٹی شاہنی —" جگدیپ کی آواز کچھ اتنی گمبھیر تھی کہ اس نے چھوٹی شاہنی کے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"تو مجھے چھوٹی شاہنی کیوں کہتا ہے — میں تیری ماں ہوں۔"

"یوں ہی کہہ رہا ہوں — سب ہی چھوٹی شاہنی کہتے ہیں — اس لیے میں بھی کہہ دیتا ہوں۔"

"اور دیپ — مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں تیری ماں نہیں ہوں۔ — تو مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح معلوم ہوتا ہے۔"

جگدیپ خاموش رہا۔ مگر اس نے چھوٹی شاہنی کی طرف کچھ اتنے لگاؤ سے دیکھا جیسے دونوں نے بہن بھائی کا رشتہ قبول کر لیا ہو۔

"اچھا تو یہ بتاؤ شادی کر کے کیا کر دوں —!"

چھوٹی شاہنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیسے اس میں اب بولنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔

"تمہیں کسی بات کی کمی نہیں محسوس ہوگی۔"

"کمی تو کوئی نہیں دیپ — مگر اب میرا جینے کو جی نہیں چاہتا —" چھوٹی شاہنی کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کے اندر زندگی کا شعلہ بجھتا جا رہا ہے۔

"ایک بات پوچھوں۔"

"تجھ سے میں کچھ نہیں چھپا سکتی دیپ۔"

"اب تو خیر تم پر قہر نازل ہوا ہے لیکن جب میں پچھلی بار یہاں آیا تھا اس وقت بھی تم —" اس سے آگے جگدیپ کو کچھ کہنے کے لیے سوجھا ہی نہیں۔

"اس وقت بھی میں زبردستی زندہ تھی —" چھوٹی شاہنی ناخنوں سے مٹی کریدنے لگی —

"میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔"

"یہ سچی بات ہے دیپ۔"

"شادی تمہاری مرضی سے نہیں ہوئی تھی —؟" جگدیپ نے ذرا رک کر پوچھا۔

کیسی مرضی ـــــ اور کس کی مرضی ـــــ میرے باپ نے مجھے بیچ دیا ---
میرا تو اس وقت بھی یہی جی چاہتا تھا۔ کہ میں کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں ـــــ
لیکن میں نے خود ہی آپ سے کہا ـــــ مر جاؤنگی تو بھی مردہ ـــــ زندہ رہوں گی
تو بھی مردہ ـــــ کوئی بات نہیں جیتے جی مر جاؤں گی ـــ باپ کا ہاتھ تو تنگ نہیں
رہے گا ـــــ میرا ایک چھوٹا سا بھائی تھا ـــــ ہو بہو تجھ جیسا معصوم ـــــ اس کے منہ
کی طرف دیکھتی اور سوچتی ۔ کوئی بات نہیں ـــ اس کے سر سے قرضے کا بھاری بوجھ
اُتر جائے گا ـــ اب وہ خوشحال ہیں ـــ اپنے گھر میں مزے سے ہیں ۔ سکھی ہیں"

جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا کہ صرف اس کے دل میں ہی غلار نہیں تھا۔ بلکہ دنیا میں ایسے کتنے ہی لوگ تھے جن کے سینوں میں بڑے بڑے گھاؤ تھے ۔

"اب تجھ سے اپنے آپ کو گھسیٹا نہیں جا رہا دیپ ـ"

جگدیپ سے کچھ بھی نہ کہا گیا ـــ چھوٹی شاہنی ہی نے کچھ دیر کے بعد کہا ۔
"دل تو میرا اسی دن کنوئیں میں ڈوب گیا تھا ـــ اب یہ تن باقی ہے ۔ مجھ سے اس کا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا"

اس کے بوجھل سکوت کو کوئی بھی نہ توڑ سکا ـــــ جگدیپ ساری شام کھیتوں کی مینڈھ پر بیٹھا رہا ۔ جہاں کہیں کنواں نظر آتا اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کنوئیں میں چھوٹی شاہنی نے چھلانگ لگا دی ہو ـــ وہ پاگلوں کی طرح اس کنوئیں میں جھانکنے لگتا ۔

جگدیپ رات گئے گھر لوٹا ـــ چھوٹی شاہنی چولھے پر توا رکھ کر اس کا انتظار کر رہی تھی ـــ جگدیپ چوکے میں جا بیٹھا تو چھوٹی شاہنی نے گرم گرم روٹی اتار کر تھالی میں ڈال دی ۔

"شہر میں تو کوئی تنور ہیں. روٹیاں نہیں پکوا تا — تو چولہے کی روٹیاں کھاتا ہوگا — میں تجھے چولہے کی روٹی پکا دیا کروں گی۔"

بہت دن ہوئے چھوٹی شاہنی نے اس سے یہ بات کہی تھی — اس دن کے بعد وہ جگدیپ کے لیے پتلی پتلی روٹیاں پکایا کرتی تھی۔

آج جگدیپ کا روٹی کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا — وہ باتیں کرنا چاہتا تھا — مگر وہ دل بہلانے کے لیے روٹی کھاتا رہا۔

کھانا ختم ہوا — چھوٹی شاہنی نے برتن سمیٹے — دہی کے لیے دودھ رکھا۔ جھاڑ پونچھ کر جگدیپ کا بستر لگایا اور پھر ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے وہ اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔

"کیا نیند نہیں آرہی دیپ —؟

"نہیں کوئی کہانی سناؤ —" جگدیپ نے بچوں کی طرح التجا کی۔

"مجھے تو سب کہانیاں بھول گئی ہیں۔"

"کسی پری کی کہانی سنا دو۔"

"کہاں ہوتی ہیں یہ پریاں دیپ — لوگوں نے یونہی باتیں بنا رکھی ہیں۔"

"بچپن میں تو کہانی سنایا کرتی ہوگی۔"

"کہانیاں سب ہی چھوٹی ہوتی ہیں دیپ —!"

"اچھا میں ایک کہانی سناتا ہوں۔"

"سناؤ"

"ایک لڑکی تھی — نہایت ہی خوبصورت — اس کے والدین کا جی چاہا کہ

وہ اس لڑکی کو بیچ کر ڈھیروں روپیہ حاصل کر لیں"۔

"چل ہٹ ــــ"

"سنو تو سہی ــــ اور پھر جب اس لڑکی نے یہ بات سنی تو وہ آگ بگولا ہو گئی ــــ کنوئیں میں چھلانگ لگانے کے لیے چل دی ــــ جب وہ کنوئیں میں کودنے لگی تو پیچھے سے آکر ایک پری نے اسے پکڑ لیا"۔

"پریاں کہاں ہوتی ہیں دیپ ــــ پریاں بھی جھوٹی ہوتی ہیں ــــ ویسے تیری ایک بات سچی ہے"۔

"کون سی ــ؟"

"جس رات کو میں کنوئیں میں چھلانگ لگانے گئی تھی ــــ میرے پیچھے پیچھے ــــ"

"کون آیا تھا ۔؟"

"جگت نے مجھے کہیں دیکھ لیا تھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ ۔ ۔"

"جگت کون ہے ؟"

"ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا ــــ دو برس سے میرے پتا کی منت سماجت کر رہا تھا کہ ویراں کی شادی مجھ سے کر دو"۔

"تمہارے پتا کیوں نہیں مانتے تھے ۔؟"

"دہی زمین کا جھنجھٹ تھا ــــ ساری زمین تو سیٹھ جی کے یہاں رہن پڑی ہوئی تھی ــــ"

ایک پتھریلا سکوت طاری ہو گیا ــــ پھر جیسے پتھر کے دل میں کوئی کیڑا اکلبلا اٹھا ۔

"جگت کیسا تھا شاہنی ۔۔؟"

"اس جیسا کون پیدا ہو سکتا ہے دیپ ۔۔۔ اس کے قدموں تلے تو دھرتی بھی کانپتی تھی ۔"

"کیا اس نے تمہارے پتا کو روکا نہیں ۔۔ ؟"

"جب ایک طرف چاندی کی جھنکار سنائی دے رہی ہو دیپ تو پھر کوئی آواز کان میں نہیں پڑتی ۔"

"کیا وہ خاموش رہا ۔ ؟"

"نہیں دیپ ۔۔۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اگر اجازت دوں تو وہ مجھے ایسی جگہ لے جائے گا جہاں کوئی میری گرد کو نہ پہنچ سکے ۔"

"پھر کیا ہوا ۔ ؟"

"میں ہی ڈر گئی ۔۔۔ ادھر میرے پتا سیٹھ جی سے وعدہ کر چکے تھے ۔۔ میں سوچتی تھی اگر میں چلی گئی تو میرے بعد میرے پتا اور میرے بھائی کا کیا حال ہو گا ۔"

"میں نے تمہیں پری کہانی سنائی ہے نا ۔ ؟"

"پری کیسے ۔ ؟"

"میں نے کہا تھا کہ جب وہ لڑکی کنوئیں میں کودنے لگی تو پیچھے سے اسے ایک پری نے پکڑ لیا ۔"

"ہاں ۔۔۔"

"اس پری کا نام زندگی بھی ہے شاہنی ۔۔۔"

"کون سی زندگی دیپ ۔ ؟"

"یہی زندگی ـــــ اور کون سی ـــ"

"سب جھوٹی باتیں ہیں دیپ ـ؟"

"جگت اب کہاں ہے ـ ؟"

"اپنے ہی گاؤں میں ـ"

"کیا تم کبھی گاؤں نہیں گئیں ـ؟"

"نہیں دیپ ـــــ جس دن میرے پتا نے مجھے ڈولی میں بٹھا کر الوداع کیا تھا اسی دن میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میں اب لوٹ کر نہیں آؤں گی ـ"

"کیوں ـ ؟"

"جن والدین نے مجھے بیچ کر دام کھرے کر لیے ـــــ میں ان کی بھلا کیا ہوتی ہوں ـ"

"انہوں نے کئی سندیسے بھیجے ـــــ سیٹھ جی سے بھی انہوں نے کہا ـــــ مگر میرا وہاں جانے کو جی نہ چاہا ـــــ اب بھی سیٹھ جی کے بیت جانے پر نیرے سامنے وہ میری منتیں کرتے رہے لیکن میں نے ایک ہی "نہیں" پکڑ لی ـــــ اور پھر دیپ ـــــ" اس سے آگے شانتی کچھ نہ کہہ سکی ـ

جگدیپ نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا ـــــ "تم کیا کہنے والی تھیں ـــــ ؟"

"پہلے چلی جاتی تو چلی جاتی ـــــ لیکن اب تو میں ہرگز نہیں جاؤں گی ـــــ اب تو مجھے قسم ہے ـ"

"کیوں ـ ؟"

"مجھے جگت سے ڈر لگتا ہے ـ"

"ابھی ابھی اس نے مجھے کسی کے ہاتھ سندیسہ بھجوایا تھا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے ـ

اگر میں رضامند ہوں تو . . . .!"

"پھر تو پری والی کہانی بالکل سچی ہے۔"

"سچی کہاں ہے دیپ ۔؟ یہ تو زخموں پر نمک چھڑکنا ہے۔"

"تم جھوٹ کو سچ کیوں نہیں بنا لیتیں ۔؟"

شاہنی تڑپ کر اپنی چارپائی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی ۔

"دیپ تو کیا کہہ رہا ہے ۔؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں ۔"

"کیا پاگل ہو گیا ہے ۔؟"

"نہیں ـــــ میں سچ کہہ رہا ہوں شاہنی۔"

بھگوان کو منظور نہیں تھا تو . . . . . ."

"اسے اب منظور ہوگا ـــــ تم جگت کو سندیسہ بھیج دو۔"

"دیپ ـــــ دیپ ـــــ!" شاہنی کی آواز کپکپا رہی تھی ۔

"ایک بار تو ہمت کر کے دیکھو شاہنی ۔"

"نہیں ـــ دیپ نہیں ـــ میں مر چکی ہوں مرے ہوئے کو اور کیوں مارتے ہو۔؟"

"اپنے دل کو مضبوط کیوں نہیں بناتی ہو شاہنی ۔"

"میں اپنا من مار چکی ہوں دیپ ـــ تو ایسی باتیں نہ کر۔"

"ذرا سوچ کر بتاؤ شاہنی ـــــ ایک طرف زندگی ہے اور ایک طرف موت ۔"

"مجھے موت ہی منظور ہے دیپ ـــــ میں جس آگ کو بجھا چکی ہوں اسے دوبارہ روشن نہ کر۔"

"کبھی کبھی پریوں کی کہانی بھی سچی ہو جاتی ہے، شاہنی۔"

ابھی تک شاہنی کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تھے۔ لیکن اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جگدیپ نے شاہنی کے پتا کو بلوا بھیجا اور اسے اس کے حوالے کر دیا۔ گاؤں والوں کو صرف اتنا پتہ چلا کہ چھوٹی شاہنی میکے جا رہی تھی ـــــ گہنوں کی صندوقچی جگدیپ نے اپنے ہاتھوں سے بھری اور چھوٹی سیٹھانی کو اس کے میکے تک چھوڑنے گیا۔

"اس گھر میں سب کچھ تمہارا ہے شاہنی ـــــ جب بھی تمہیں ضرورت ہو اور جتنی بھی ضرورت ہو ـــــ"

"مجھے شرمندہ نہ کرو دیپ ـــــ" شاہنی جگدیپ کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ اور پھر اس نے کہا ـــــ "مجھے شاہنی کیوں کہتے ہو ـــــ ویراں کہو ویراں ۔۔۔۔"

گاؤں سے لوٹتے ہوئے جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں خلا پڑ گیا تھا ـــــ ایک سرور، ایک خمار میں وہ گھوڑی پر سوار رہا۔ اور نہ جانے کب واپس گاؤں لوٹ آیا۔ اس نے اپنی گھوڑی کا رخ چچی بیگماں کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ گھوڑی سے اتر کر مکان کے پچھواڑے میں برگد کے پیڑ تلے جا کھڑا ہوا۔

برگد کی چھاؤں اسے آج جتنی کبھی حسین نہیں معلوم ہوئی تھی ـــ برگد کے پتّوں سے اس نے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں ـــ اور پھر اس کے دل میں ایک کسک پیدا ہوئی ـــ " چھاؤں ـــ صرف چھاؤں ـــ ایک بھی پھل نہیں ۔ تو نے کہا تھا نوراں کہ بیری کا پیڑ لگائیں ـــ سرخ سرخ میٹھے بیر کھائیں گے ۔ آم کا پیڑ لگالیں لیکن میں نے ہی کہا تھا ـــ " پھلوں کی کیا ضرورت ہے ـــ میرے لیے چھاؤں ہی بہت ہے ـــ نوراں ـــ نوراں ـــ میری قسمت میں کوئی پھل نہیں تھا ۔!"

جگدیپ نے فائن آرٹس کورس کے دونوں سال پورے کر لیے ـــــ اسکول کے پرنسپل نے دیکھا کہ جگدیپ کے اندر کوئی چنگاری سلک رہی ہے اس کی بنائی ہوئی تصویروں میں ایک معنویت ہوتی تھی اور اس کے رنگوں سے اس کے دل کی حرارت آشکار ہوتی تھی ۔ پرنسپل یہ نہیں چاہتا تھا کہ جگدیپ اس اسکول کو چھوڑ کر چلا جائے ۔

اس نے جگدیپ کو اس اسکول میں ملازمت کی پیش کش کی ۔ مگر اس کو نوکری کی خواہش نہیں تھی ـــــ ایک عظیم فن اس کے اندر جیسے انگڑائیاں لے رہا تھا ۔ گاؤں کی زمین سے جگدیپ کو گزر بسر کے لیے اچھا پیسہ مل رہا تھا ـــ اس لیے اب اپنے ماموں کے مکان کی بالائی منزل پر اپنے لیے دو کمرے تعمیر کروالئے تھے ـــــ ایک کمرے کو اپنا سٹوڈیو اور دوسرے کو اپنی خواب گاہ بنا لیا تھا ۔

"جس منزل کی آرزو آپ نے میرے دل میں پیدا کی ہے ۔ اب ذرا اس کی دشواریوں کا مجھے سامنا کرنے دیجئے اور اس طویل راستے پر جہاں تک میں چل سکتا ہوں مجھے چلنے دیجئے ـــــ مجھے ملازمت کے بندھنوں میں آپ کیوں جکڑتے ہیں "

" جگدیپ نے اپنے پرنسپل کو منالیا ـــــ "

"میں ماڈل سے پینٹنگ کرنا چاہتا ہوں —— آپ میری رہنمائی کرتے رہیئے گا۔" ایک دن جگدیپ نے اپنے پرنسپل سے کہا۔

"ہمارے ملک میں اس کا رواج نہیں —— کوئی لڑکی ماڈل بننے کے لیے تیار نہیں ہوگی —— تم کیا کروگے —— یہ کیسے ہوگا —— ؟ پرنسپل کو یقین تھا کہ جگدیپ جیسا شاگرد نہ پہلے اسے ملا تھا اور نہ آئندہ کبھی ملے گا —— وہ اس کے اندر کی چنگاری کو بجھنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

لیکن سماجی ماحول اتنا اچھا نہیں تھا —— اس کو اپنے سامنے کئی دشواریاں نظر آرہی تھیں —— دوسرے دن پرنسپل نے جگدیپ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تمہارا کردار فولاد کی طرح مضبوط ہونا چاہیئے دیپ —— جب ہی تمہارے اندر کا فنکار زندہ رہے گا۔"

چند روز بعد ایک شام کو پرنسپل نے آکر جگدیپ کے سٹوڈیو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

جگدیپ نے دروازہ کھول دیا —— ایک سانولی اور خوش جمال لڑکی پرنسپل کے ساتھ تھی۔

"یہ رمندر ہے —— میری بیٹی —— میرے دوست کی بیٹی —— ہم اسے رمی کہہ کر بلاتے ہیں۔"

جگدیپ کو اب اس سے آگے کوئی استفسار کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کو اتنی توقع ہی نہیں تھی —— جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے ہوں۔

"میں جلدی میں ہوں —— ٹھیک ساڑھے چار بجے میرا لیکچر ہے —— سوا چار

ہو چکے — پرنسپل نے جگدیپ کے کندھے پر ایک تھپکی دی اور الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

"رمندر بہن — میں تمہارا کیونکر شکریہ ادا کروں — ؟" جگدیپ نے ایک نفیس کرسی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رمندر بیٹھ گئی لیکن اس نے کسی جوش و خروش کا اظہار نہ کیا۔ جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے رمندر کو اس کا اپنا اشتیاق کھینچ کر نہ لایا ہو — پتا کا یا پتا کے دوست کا کہا نہ ٹال سکی ہو اور آگئی ہو۔

اس کے باوجود جگدیپ کے اشتیاق میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے رمندر کا دل بہلانے کے لیے بڑے چاؤ کے ساتھ کہا — "میں پرنسپل صاحب کی ہر ایک توقع پر پورا اتروں گا — میں بڑی محنت کروں گا — دن رات محنت کروں گا۔"

رمندر نے جیسے جگدیپ کی بات کو غور سے نہ سنا — جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنی بات کو ٹھیک طرح نہ کہہ پایا ہو — اس نے کچھ اور بھی کہنا چاہا مگر رمندر اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔

جگدیپ خاموش ہو گیا — اچانک اُس کے دل میں یہ یقین پیدا ہوا کہ وہ تھوڑے سے ہی دنوں میں رمندر کا اعتماد حاصل کر لے گا اور پھر وہ آج کی طرح بیدل نہیں رہے گی — آج جگدیپ نے اپنے پرنسپل کی اس ہدایت کا مطلب پالیا — "تمہارا کردار فولاد کی طرح مضبوط ہونا چاہیئے دیپ — جب ہی تیرا اندر کا فن کار زندہ رہے گا۔"

"کیا میں آپ کو اپنی کچھ تصویریں دکھاؤں — ؟ اچھی تصویریں تو نہیں ہیں — ابھی میرے ہاتھ میں پختگی نہیں آئی —"

"میں نے آپ کی تقریباً تمام تصویریں دیکھی ہوئی ہیں —" رمندر نے آہستہ سے کہا —

"شاید پرنسپل صاحب ان تصویروں کو گھر لے جاتے رہے ہیں —" جگدیپ یہ کہہ خاموش ہو گیا — اسے اس بات پر حیرانی ہوئی کہ اتنا پُر تپاک دل رکھنے والا پرنسپل ایسی روکھی پھیکی لڑکی کو اپنی بیٹی کیونکر کہتا ہے۔

"کیا چائے منگواؤں — آپ تھک گئی ہوں گی —" جگدیپ نے کہا۔

"نہیں —"

"بات جگدیپ کی سمجھ میں نہ آئی — رمندر کی "نہیں" — کچھ ایسی تھی کہ اسے دوبارہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

آپ اب تھک گئی ہوں گی — کیا آپ پھر کسی دن آسکیں گی — ؟" جگدیپ نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

"کل آؤں گی —" رمندر بولی اور پھر جگدیپ سے کچھ کہے بغیر تصویر کی طرف ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

"کیا میں آپ کو چھوڑ آؤں — ؟" جگدیپ نے دوڑ کر پوچھا۔

"نہیں — میرا سائیکل نیچے پڑا ہے — میں خود چلی جاؤں گی"

رمندر نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔

جگدیپ اپنے اسٹوڈیو میں لوٹ آیا — یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ رمندر کا وطیرہ اچھا تھا یا برا — لیکن اسے اتنا ضرور محسوس ہوا کہ کمرے کی ہوا بوجھل ہو گئی تھی — پھر اس نے تصویر کی طرف نظر دوڑائی — تصویر ادھوری تھی — بالکل نامکمل —

مگر لکیروں میں سے ایک اچھی تصویر اُبھرتی ہوئی نظر آنے لگی تھی ــــ وہ سوچنا چھوڑ کر تصویر کی لکیروں کو مزید سلوارنے میں مصروف ہو گیا ۔

رمندر اگلے روز بھی آئی ــــ اس سے اگلے دن بھی اور پھر وہ روز آنے لگی ۔ جیسے وقت مقرر کرنے یا کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی ــــ وہ عین وقت پر آتی اور واپس چلی جاتی ۔

ہر روز جگدیپ حسبِ معمول اسے چائے پینے کے لیے کہتا اور ہر روز وہ سخت گیر لہجہ میں انکار کر دیتی ــــ تصویر کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر بھی منہ سے کچھ نہ کہتی ــــ اس کی بے رخی نے اسے جیسے جکڑ رکھا تھا ۔

دسمبر میں دن کو بھی ہر ایک پل تیخ بستہ ہوتا ہے ــــ رمندر جب آتی تھی تو اس نے شال اوڑھا رکھا ہوتا تھا مگر تصویر کے سامنے بیٹھتے ہوئے اسے اپنا شال اتارنا پڑتا تھا ۔ اور اس سے انگ انگ میں سرایت کرتی ہوئی سردی اس کے چہرے پر بخوبی ہویدا ہونے لگتی تھی ۔ جگدیپ نے کمرے میں انگیٹھی کا انتظام کر لیا اور کمرہ کافی گرم ہو گیا رمندر آرام سے بیٹھ جاتی مگر ابھی تک اس نے جگدیپ کی فرمائش پر ایک پیالی چائے نہیں پی تھی ۔" پا پاجی کہہ رہے تھے کہ اگر آپ کھیتوں پر جا کر خاکہ بنانا چاہیں ۔ تو میں آپ کے ساتھ جا سکتی ہوں ــــ ایک دن رمندر نے کہا ۔

جگدیپ خوشی سے اچھل پڑا ۔

رمندر کی بے رخی سے اگرچہ وہ مایوس ہو چکا تھا ۔ لیکن آج جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی بے رخی کانٹوں کی طرح چبھنے لگی ۔ ساتھ ہی ساتھ رمندر کا یہ فقرہ " پاپاجی نے کہا تھا اگر ــــ تو میں آپ کے ساتھ جا سکتی ہوں ــــ اس کے دل پر ایک

تازیانہ کی طرح پڑا۔ جانے نہ جانے کا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا ـــــ وہ تو جیسے اپنے پاپا جی کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی ۔

کیسے چلیں گے ـــــ ؟ سامان ایک تانگہ میں رکھ لیں گے ـــــ " جگدیپ نے کہا ۔

کیوں ـــــ ؟ سائیکلوں پر چلیں گے ـــــ میں اپنے سائیکل پر آجاؤں گی ۔ آپ اپنی چیزیں اپنے سائیکل پر رکھ لیجئے گا ـــــ کل گیارہ بجے " اور رمندر یہ حکم دے کر وہاں سے چلی گئی ۔

جگدیپ نے کئی باتیں سوچیں ـــــ دوپہر کی روٹی بنوا کر ساتھ لے چلے ـــــ تھرموس میں چائے لے چلے ـــــ لیکن رمندر کی نہیں ـــــ " اس کے دل میں ایک پتھر کی طرح جم گئی تھی اور اس پتھر کو ہٹانے کی اس میں جرأت نہیں تھی ۔

دوسرے دن گیارہ بجے تھے جب رمندر آئی ـــــ جگدیپ نے اپنا سامان اپنے سائیکل کے آگے اور پیچھے باندھ لیا اور پھر بڑی جسارت سے کام لیتے ہوئے اس نے رمندر سے پوچھا ـــــ " کیا کچھ کھانے کے لیے راستہ میں لیتے چلیں ۔؟"

" کوئی ضرورت نہیں ـــــ یہ کہہ کر رمندر نے اپنے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں رکھ دیا ۔

چھ سات میل تک سائیکل چلانے کے بعد جگدیپ اور رمندر شہر کے باہر نہر سے گذر کر کھیتوں میں پہنچ گئے ـــــ جگدیپ نے ایک دل پسند جگہ کا انتخاب کیا اور سائیکل ایک طرف رکھ کر سامان کھولنے لگا ۔

جگدیپ ایک یا ڈیڑھ بجے تک کام کرتا رہا ۔ سرسوں کے کھیتوں کا سونا جگدیپ کے کاغذوں پر اترتا رہا اور پھر جگدیپ کی نگاہ ایک انتہائی سوکھے ہوئے پیڑ پر پڑی ـــــ اچانک اسے ایک خیال سوجھا ـــــ سوکھے ہوئے پیڑ کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی

تھیں لیکن ایک بھی پتہ کسی شاخ کے ہاتھ میں نہیں تھا ـــــ، اگر اس پیڑ کے تنے کے ساتھ لگ کر رمندر کھڑی ہو ـــــ میں تصویر بناؤں اور اس کے نیچے لکھ دوں ـــــ پت جھڑ اور بہار ـــــ!"

وہ کاغذ پر سرسوں کے کھیتوں کا سونا ایک طرف رکھ کے "پت جھڑ اور بہار!" کی تصویر بنانے لگا۔

دو بج گئے ـــــ جگدیپ نے ہاتھ سے برش ایک طرف رکھتے ہوئے کہا ـــــ "دیوی جی ـــــ آپ تو برت رکھ سکتی ہیں لیکن میں نہیں رکھ سکتا ـــــ آؤ واپس چلیں"

رمندر نے اپنے سائیکل سے بندھی ہوئی ٹوکری کھولی اور ایک طرف تولیہ بچھا کر بندھے ہوئے پیکٹ کھول دیئے ـــــ رمندر تھرموس میں نہ چائے لانا بھولی تھی نہ پلیٹ اور پیالیاں ـــــ کھانے والی چیزوں کے پیکٹ اتنے تھے کہ وہ دونوں مل کر انہیں دن بھر ختم نہیں کر سکتے تھے۔

سب چیزیں نہایت اچھی تھیں۔ جگدیپ کھائے چلا جا رہا تھا۔ ابھی پلیٹ میں پہلی چیز ختم نہیں ہونے پاتی تھی کہ رمندر اس میں اور ڈال دیتی تھی اور جگدیپ ضرورت سے زیادہ کھا رہا تھا لیکن اس کے دل پر جو بوجھ تھا اس سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا ـــــ "میں رمندر کا اعتماد نہیں حاصل کر سکا۔ میرے اتنے دنوں کا برتاؤ ـــــ میری محنت . . . "

جگدیپ نے اپنے دل کو ذرا اور ٹٹولا ـــــ "پچھلے دنوں جگدیپ کے دوستوں نے اس پر کئی آوازے کسے تھے ـــــ "آج کل تم بھلا کسی سے کیوں ملنے لگے ـــــ ایسا ماڈل ہاتھ تو دوست نظروں پر کہاں چڑھتے ہیں ـــــ" جگدیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور

اس نے گرج کر دوستوں سے کہا تھا ـــــ "رمندر تو مجھے اپنی بہن سے بھی زیادہ ۔ ۔ ۔ ۔!"

کھانا ختم ہوا ـــــ رمندر نے جگدیپ کو چائے کی پیالی دی ـــــ اس کے بعد مزید دو گھنٹے کام کر کے دونوں اپنے سائیکلوں پر واپس چلے آئے ۔

سردیوں میں بھرپور محنت کرنے کے بعد جگدیپ نے کئی تصویریں بنائیں لیکن تین تصویریں اس نے بڑی جانفشانی سے تیار کی تھیں ـــــ ایک تصویر کا عنوان تھا۔ "دنیا" اس تصویر میں جو لڑکی تھی وہ اس نے رمندر کے ماڈل سے تیار کی تھی ـــــ دنیا اسے خوبصورت معلوم ہوئی تھی ـــــ دنیا کا رنگ اس نے اپنے تصور سے بھرا تھا ـــــ دوسری تصویر: "پت جھڑ اور بہار" تھی ـــــ یہ تصویر اس نے سوکھے پیڑ اور رمندر کے بُت کو جوڑ کر تیار کی تھی ـــــ تیسری تصویر کتنے برس ہوئے نوراں کے سر پر ستاروں والا دوپٹہ پہنا کر اس نے جو خاکہ بنایا تھا اس سے تیار کی تھی ـــــ اس تصویر کا نام "سپنا" رکھا تھا ـــــ ستاروں والے دوپٹہ کے ارد گرد اس نے بادلوں کی طرح سپنے لپیٹ دیئے تھے اور نوراں کی آنکھیں اس طرح تھیں جیسے وہ سپنوں کے بوجھ سے جھک گئی ہوں ۔

مارچ کا مہینہ آپہنچا ——— شہر کی ایک نہایت اچھی عمارت میں ہندوستان کے مشہور مصوروں کی تصویروں کی نمائش منعقد ہونے والی تھی ——— پرنسپل کی فرمائش تھی کہ اس نمائش میں جگدیپ کی ایک پینٹنگ رکھی جائے ——— جگدیپ ابھی اپنے فن کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا۔

بہت سی باتوں میں پرنسپل کی رائے اسے زیادہ وزنی نہیں معلوم ہوتی تھی ——— اس نے انکار کر دیا ——— پرنسپل نے اس کی تصویر کے لیے جگہ محفوظ کرالی تھی اور وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ اُس نے جگدیپ کے اسٹوڈیو میں آکر تینوں تصویریں دیکھیں۔ ہر ایک تصویر کی بار بار جانچ کی اور آخرکار اس نے "سپنا" عنوان کی تصویر کو نمائش میں بھیجنے کے لیے منتخب کر لیا۔

"کتنی قیمت کی چٹ لگائی جائے ——— " پرنسپل نے پوچھا ——— اس کے پاس رمندر بھی کھڑی تھی اور جگدیپ بھی ——— دونوں میں سے کوئی نہ بولا۔ پرنسپل نے خود ہی کہا ——— "دو سو سے کم نہیں ہونی چاہیئے ——— "

"میں یہ تصویر بیچنا نہیں چاہتا ——— !" جگدیپ نے آہستہ سے کہا۔

"خریدتا کون ہے ——— یونہی ایک رواج ہے ——— قیمت کی چٹ ضرور لگانی چاہیئے۔"

"نہیں ــــ یہ چٹ لگا دو ـــ تصویر بیچنے کے لیے نہیں ہے ـــ"

ایسا کرنا غرور کے مترادف ہوگا ـــ اچھا ایسا کرو ـــ دو سو کی جگہ تین سو لکھ دو تاکہ اگر کوئی خریدنا بھی چاہے تو نہ خریدے ـ ساڑھے تین سو لکھ دو ـ

جگدیپ خاموش ہوگیا ـــ رمندر نے بھی کچھ نہ کہا ـ پرنسپل نے وہ تصویر نمائش میں بھیج دی

نمائش منعقد ہوئی ـ شائقین اور فن کاروں کا ایک جمگھٹا لگ گیا ـ شہر میں نمائش کی باتیں ہوئیں ـــ ان باتوں میں عقل و دانش کو دخل نہیں تھا صرف رسماً ایسی باتیں کی جاتی تھیں ـــ یہ ٹھیک تھا کہ لوگ اپنے آپ کو فن کار کا پرستار ظاہر کرنے کے لیے باتیں چھیڑ دیتے تھے مگر یہ بھی درست تھا کہ جہاں دو چار جمع ہوئے اِن تصویروں کی باتیں کرنے لگے ـ

پھر پتہ چلا کہ جگدیپ کی تصویر فروخت ہوگئی ہے ـــ نمائش کے منتظمین نے اسے مبارک باد دی ـــ لوگ اب اور بھی زیادہ اشتیاق کے ساتھ اس تصویر کو دیکھ رہے تھے لیکن جگدیپ کا چہرہ کچھ اس طرح ہوگیا جیسے کسی نے اِس کو دھکا دے کر اس کے ہاتھ سے اس کی چیز چھین لی ہو ـ

نمائش ختم ہوگئی ـــ جگدیپ چپ چاپ اپنے سٹوڈیو میں بیٹھا رہتا ان دنوں اپنے برشوں اور رنگوں کی طرف دیکھنے کو اس کی طبیعت نہیں چاہتی تھی ـ رمندر بھی کئی دنوں سے نہیں آئی تھی ـــ جگدیپ کے سٹوڈیو پر جیسے ویرانی اور سُونا پن مسلط ہوتا جا رہا تھا ـ

ایک دن جگدیپ اپنی اداسی کو برداشت نہ کر سکا اور وہ پرنسپل سے ملنے کیلئے

اس کے گھر چلا ــــ پرنسپل گھر پر موجود نہیں تھے ــــ اس نے رمندر کے گھر کا پتہ پوچھا اور ادھر چلا گیا۔

شام کا ہلکا دھندلکا اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا ــــ نوکر نے اسے رمندر کا کمرہ دکھایا اور کمرے کے دروازہ کو اس نے آہستہ سے ٹھوکر لگائی ــــ سامنے رمندر کھڑی تھی۔

"آپ ــــ" رمندر جیسے کانپ گئی۔

جگدیپ اب رمندر کی بے رخی سے بالکل مانوس ہو چکا تھا ــــ اس کی بے اعتنائی کو اب وہ اس کی فطرتِ ثانی تسلیم کر چکا تھا ــــ آج جگدیپ حیران تھا رمندر کی گھبراہٹ نے اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دی تھی۔

جگدیپ کمرے میں دو قدم آگے بڑھ چکا تھا لیکن وہ وہیں کا وہیں رُک گیا ــــ اور رمندر نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے کرُسی کا سہارا لیا۔

"ری لیا میں چلا جاؤں ــ؟" جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس سے کوئی بھاری گناہ سرزد ہو گیا تھا۔

رمندر کا رنگ نچڑے ہوئے لیموں کی طرح زرد تھا ــــ اس سے کچھ کہا نہ گیا ــــ جگدیپ نے گھبرا کے کمرے میں دیکھا ــــ سامنے پڑی الماری کے دونوں پٹ کھلے تھے ــــ الماری میں اس کی تصویر "سپنا" پڑی ہوئی تھی۔

"ری ــــ جگدیپ کے منہ سے نکلا اور وہ گھبرا کر الماری کی طرف لپکا ــــ

جگدیپ نے ایک بار تصویر پر نظر دوڑائی اور پھر رمندر کی طرف دیکھا ــــ رمندر اپنی ہتھیلیوں سے منہ کو چھپا کر سسکیاں لے رہی تھی۔

"نہیں ــــ!" جگدیپ کی رگ رگ میں جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ بھر دیا تھا۔

"ہاں ــــ میں نے ہی خریدی ہے ــــــ" رمندر شاید اپنے آنسوؤں کی کمزوری پر جھلا اٹھی تھی اسے پھر اپنے آپ پر غصّہ آگیا تھا۔

رمندر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر اس نے آہستہ سے کہا ــ تمہیں یہ تصویر خریدنے کی کیا ضرورت تھی ــ تم مجھ سے کہتیں ــ میں اسے تمہارے کمرے میں آکر لٹکا دیتا۔"

رمندر کے انگ انگ میں جیسے زہر جوش مار اٹھا اور وہ کرسی سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی الماری کی طرف گئی ــــ تصویر رمندر کے ہاتھوں میں تھی اور پھر وہ پورا زور لگا کر تصویر کے پرزے اڑانے لگی۔

جگدیپ پتھر کی طرح جم گیا تھا ــــ رمندر کہہ رہی تھی ــــ نوراں ــــــ نوراں ــــ نوراں ــــ میں اس کی تصویر کو برداشت نہیں کرسکتی ــــ نہیں کرسکتی۔ میں نے اس کو اسی لیے خریدا تھا کہ پھاڑ کر پھینک دوں ــــ!"

کاغذ کے ٹکڑے فرش پر چاروں طرف پھیل گئے ــــ کاغذ کے کتنے ہی ٹکڑے جگدیپ کے قدموں کے قریب پڑے ہوئے تھے ــــ رمندر نے شاید کچھ اور بھی کہا لیکن جگدیپ کو اب کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا ــــ ایک ہی لفظ جگدیپ کے کانوں میں گونج رہا تھا ــــ نوراں ــــ نوراں ــــ نوراں ــــ"

پتہ نہیں کب وہ اس کمرے سے اٹھ کر چلا آیا ــــ رمندر کاغذ کے ان ٹکڑوں کے پاس فرش پر بیٹھی سسک رہی تھی ــــ

شہر کی فضا میں اب جگدیپ سے سانس نہیں لیا جاتا تھا ـــــ کسی روز وہ گھنٹوں نہر کے کنارے بیٹھا رہتا اور کسی روز شہر سے دُور کھیتوں کی مینڈھ پر ـــــ اسے یُوں محسوس ہوتا شہر کی فضا میں جیسے تلخی گھُلی ہوئی تھی ـــــ تشنگی سے اس کا حلق سوکھتا جا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر کڑوی اور کسیلی پپڑیاں جمتی جا رہی تھیں۔

سٹوڈیو میں بیٹھا ہوتا تو جگدیپ کو یُوں لگتا جیسے تمام رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہوں گے ـــــ ایک میلی اور کالی دھار بن کر اس کی آنکھوں پر برس رہے ہوں ـــــ

کئی برس ہوئے جگدیپ نے ایک خواب دیکھا تھا ـــــ کوئی نوراں کے سر پر اوڑھی ہوئی تاروں والی چنری کے تارے ادھیڑ رہا تھا ـــــ آج کئی برسوں کے بعد وہ خواب اور بھی بھیانک ہو گیا تھا ـــــ کوئی نوراں کے چہرے کو ناخنوں سے نوچ رہا تھا ـــــ

اگلے ہفتہ جگدیپ لاہور چھوڑ کر چلا گیا ـــــ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے گاؤں جائے لیکن جب اسے گاؤں کا خیال آیا تو کسی نے جیسے اس کو پکارا نہیں۔ جیسے کسی نے اس کا خیر مقدم نہ کیا ـــــ اس کا فن ہی اسے آنگی کے اشارے سے اپنے پاس بلا

رہا تھا وہ اس کے قریب جاتا تو اس کا فن اس سے اور بھی دور نکل جاتا اور پھر اسے اشاروں سے اپنے پاس بلانے لگتا ـــــ وہ اور آگے بڑھتا ـــــ اس کا فن اس سے بھی آگے نکل جاتا ـــــ جگدیپ اس کے پیچھے پیچھے مزید آگے بڑھتا گیا۔

دِلّی آکر جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے فن نے دھرتی پر اس کے لیے کوئی مقام پیدا کر دیا ہو ـــــ تین کمروں کا ایک فلیٹ کرایہ پر لے کر جگدیپ نے وہاں اپنا سٹوڈیو بنایا ـــــ اب اس کی لکیروں میں ایک لچک پیدا ہوتی جا رہی تھی ـــــ رنگوں میں پیارے پیارے سپنے گھُلتے جا رہے تھے ـــــ اس نے اپنے دن اور اپنی راتیں اپنے فن کے حوالے کر دیں ـــــ یہاں کئی فن کاروں سے اس کا واسطہ پڑا۔ کبھی اسے قدیم فنِ مصوری اپنی طرف کھینچتا اور کبھی وہ جدید آرٹ کی تکنیک پر غور کرنے لگتا۔ بحث ہوتی۔ غیر ممالک کے فن مصوری کی نمائش لگتی ـــــ اس کی واقفیت کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

اور پھر ایک حادثہ اس کی زندگی پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح ٹوٹا۔ ایک دن اس کے ایک دوست مصوّر نے اس سے کہا کہ اس کی واقف دو لڑکیاں ایک دو روز کے لیے اس شہر میں آرہی ہیں۔ ان کی رہائش کا کوئی انتظام نہیں ہے اگر وہ ایک دو روز کے لیے اپنے فلیٹ کا ایک کمرہ دیدے تو وہ اس کا بیحد ممنون ہوگا۔

دوسرے دن رات کو دس بجے اس کا دوست اس کے پاس آیا ـــــ اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں ـــــ انہوں نے کمرہ کھولا اور وہ اس میں چلے گئے۔

جگدیپ نے اپنے نوکر سے ان کے لیے کھانا تیار کروالیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے گیارہ بج گئے ـــــ دونوں لڑکیاں اور اس کا دوست کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

کوئی آدھ گھنٹہ چاروں مل کر تاش کھیلتے رہے اور پھر جگدیپ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

نہ جانے رات کے کتنے بجے تھے جب کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جگدیپ نے دروازہ کھول دیا ـــ ان دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی اسکے کمرے میں آگئی ـــ

جگدیپ ابھی تک اس سے کوئی سوال نہیں کر سکا تھا ـــ لیکن اس لڑکی نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بجلی بجھا دی۔

جگدیپ کی آواز جیسے اس کے حلق میں اٹک گئی ـــ ایک پتلا اور نازک بدن اس کے بدن سے چمٹ گیا۔ پتلی پتلی باہیں اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھیں اور کسی کا سانس اس کے سانسوں کو چھو رہا تھا۔

جگدیپ کو یوں لگا جیسے اس کے ہوش اڑتے جا رہے ہوں۔ پانی کی ایک لہر نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور وہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے پانی میں نہ جانے کس طرف بہتا چلا جا رہا تھا ـــ کنارا کہاں رہ گیا تھا اور کتنی دور تھا ـــ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ـــ کسی نے جگدیپ کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں لیے ہوئے تھے۔

ایک اور لہر آئی ـــ اس کے جسم کو ایک دھکا سا لگا ـــ وہ اپنے پلنگ پر گر پڑا ـــ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے دریا میں سے نکال کر سمندر میں پھینک دیا تھا۔

اس کے ذہن میں جیسے بادل گرج رہے تھے ـــ وہ اکیلا تھا ـــ بالکل تنہا ـــ بادل گرج رہے تھے ـــ ایک طوفان اٹھا ہوا تھا ـــ اس نے گھبرا کر کسی کو پکارنا چاہا۔

مگر اس نے دیکھا کہ بادلوں کی گھن گرج میں اسے اپنی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر بادلوں کی گرج میں بجلی چمک اٹھی ــــ اس نے بجلی کی روشنی میں دیکھا کہ وہ کہاں تھا۔ وہی پلنگ تھا اور چھریرے بدن کی ایک نازک سی لڑکی اس کی قمیض کے بٹن کھول رہی تھی ــــ اس نے تڑپ کر کہا:

"تم کون ہو ــــ؟"

"کون بھی ہوں ــــ آج کی رات میں تمہاری ہوں۔"

"نہیں ــــ نہیں ــــ تم میری نہیں ہو ــــ چلی جاؤ۔"

"کہاں جاؤں بابو ــ؟"

"میں نہیں جانتا تم چلی جاؤ۔"

"یہ کیا مذاق ہے بابو؟"

"میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں ــــ چلی جاؤ۔"

"مجھے بلوایا کیوں تھا ــــ؟"

"تمہیں کس نے بلوایا ہے ــ؟"

"تمہارے دوست نے ــــ"

"کون سا دوست ــــ؟"

"تمہارے دوست شنکر نے۔"

"شنکر کہاں ہے ــ؟"

"ساتھ کے کمرے میں۔"

"تم اس کے پاس چلی جاؤ۔"

"اس کے پاس تو دوسری لڑکی ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا —— کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا میں اپنی آج کی رات تباہ کر دوں۔ میرے پیسے کون دیگا؟"

"کیسے پیسے۔؟"

"شنکر نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے پچاس روپے ملیں گے۔"

"پچاس روپے۔ کیسے پچاس روپے۔؟"

"آج کی رات کے پچاس روپے۔"

"میں تمہیں پچاس روپے دیدوں گا۔ لیکن تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

لڑکی نے غصہ سے اپنے دونوں ہاتھوں کو زور سے مروڑا اور اس کے ہاتھوں میں کوئی بھکارن ہوں —؟ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا جگدیپ اب اس کی سسکیوں کی آواز سن رہا تھا۔

بجلی چمک کر غائب ہو چکی تھی۔ لیکن غائب ہونے کے بعد تاریکی میں اور بھی اضافہ کر گئی تھی —— اس اندھیرے میں جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پہلو کے ساتھ چمٹا ہوا سسک رہا تھا — جگدیپ نے سسکتی ہوئی اس لڑکی کو زور سے بھینچ لیا اور پھر خود کو اس کی آغوش کے حوالے کر دیا۔

جگدیپ کی آنکھ کھلی تو شنکر اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کے ہنس رہا تھا۔

"صاحب — چائے پی لیجئے —— آج میں آپ کا بیرا بنا ہوا ہوں۔"

"تم ہو شنکر —؟"

"میں جانتا تھا صاحب کی یہی حالت ہوگی ـــ اسی لیے میں نے نوکر کو چائے لیکر آنے نہیں دیا۔"

"شنکر۔"

"دیکھا تمہیں کیسا چونکا دیا"!

"چپ رہو شنکر۔"

"اتنا کیوں بنتے ہو یار ـــ کتنی پُر لطف رات کٹوائی ہے۔"

جگدیپ سے اب کچھ نہ کہا گیا ـــ شنکر نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔" پہلے تو تم نے اس لڑکی کو ڈرا ہی دیا تھا۔"

جگدیپ نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا ـــ اس نے چپکے سے چادر ایک طرف ہٹا دی ـــ پھٹی ہوئی قمیص گلے سے اتار کر نئی قمیص پہن لی۔

میز پر چائے پڑی ہوئی تھی ـــ جگدیپ اسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اور الماری میں سے سو روپیہ کا نوٹ نکال کر جگدیپ نے شنکر کے ہاتھ میں تھما دیا۔" شنکر اس وقت تم چلے جاؤ ـــ فوراً چلے جاؤ ـــ "

جگدیپ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلا ـــ تھوڑی سی دیر کے بعد ایک ٹیکسی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور پھر ساتھ کے کمرے میں سب کے چلے جانے کا شور سنائی دیا۔

ایک لمبا سانس لے کر جگدیپ اٹھا اور اپنی الماری کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا ـــ دیکھتا رہا ـــ دیکھتا رہا ـــ اور پھر جیسے آئینہ میں نظر آنے ہوتے چہرے کو وہ پہچان نہ سکا ـــ وہ پھر ایک گہرا سانس لیکر آئینہ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

جب سے رمندر نے نوراں کی تصویر کے ٹکڑے کیے تھے تب سے جگدیپ نے کئی تصویریں بنائی تھیں۔ لیکن ستاروں جڑی پوشاک والی نوراں بنانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی تھی۔

تازہ حادثہ کے بعد جگدیپ کو اپنا آپ ایک اُگلا ہُوا نوالہ محسوس ہونے لگا۔ ایک ہی خیال تھا اور ایک ہی چہرہ تھا جس کے متعلق سوچتے ہوئے جگدیپ کو اپنا آپ پاکیزہ معلوم ہوتا تھا ـــــ اس تصویر کو دوبارہ بنانے کا جنون اس کے سر پر سوار ہو گیا۔

کئی برس ہوئے جب وہ آرٹ اسکول میں پڑھتا تھا اُس نے گاؤں میں اپنے مکان کے چوبارہ میں اپنے ادھورے اور ناپختہ فن کے ساتھ نوراں کا جو خاکہ بنایا تھا اسے ڈھونڈ کر نکالا اور اس کی بنیاد پر اپنے تصویر میں رنگ بھرنے لگا۔

تصویر بنتی چلی گئی ـــــ اس تصویر سے بھی کہیں زیادہ حسین تصویر جسے رمندر نے پھاڑ دیا تھا ـــ جوں جوں تصویر مکمل ہوتی گئی توں توں جگدیپ کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہُوا محسوس ہوا ـــ اور جب تصویر کو فریم کر والنے کے بعد جگدیپ نے اسے اپنے سٹوڈیو میں لٹکایا تو اس دن اسے یوں محسوس ہُوا جیسے اس کے ماتھے پر ہتھوڑے کی چوٹ کا نشان مٹ گیا ہو۔

۱۹۴۷ء کے آخر میں جگدیپ کا دل دلّی سے اُوب گیا۔

اجنتا ایلورا کے غاروں اور جنوبی ہند کے مندروں کی مورتیوں نے اسے پکارا۔

اپنے فلیٹ کے دو کمروں کو بند کر کے اس نے تیسرا کمرہ اپنے ایک دوست پریم کو رہنے کے لیے دیدیا اور آپ اپنے فن کے بلاوے پر نکل کھڑا ہُوا۔

۱۹۴۷ء کا سال گزر گیا اور اب ۱۹۴۸ء بھی بیت رہا تھا۔ جب وہ دلی واپس آیا۔ اخباروں میں اس نے بہت کچھ پڑھا تھا۔ گاؤں سے جب بھی روپے آتے تھے تو چچا کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوتی تھی۔ پنجاب کے متعلق بہت کچھ لکھا ہوتا تھا لیکن جو کچھ اس نے دلی آکر دیکھا تھا وہ اس کی سوچ سے باہر تھا۔ مگر لوگ کہہ رہے تھے کہ زندگی اپنے اصل مقام آگئی ہے۔

وہ بار بار لوگوں کے مرجھائے ہوئے چہروں کی طرف دیکھتا۔ لکھ پتی کنگال ہو گئے تھے اور جو لوگ اپنے کنبوں کے افراد سے ہاتھ دھو کر آئے تھے اُن کے چہرے اس طرح تھے۔ جیسے ان کے انگ کٹ گئے ہیں اور اب وہ اپاہج بن کر اس دھرتی پر رینگ رہے ہوں۔ جگدیپ کو کبھی ۱۹۴۷ء کی تباہی عظیم نظر آتی اور کبھی اس تباہی سے خریدی ہوئی دیش کی آزادی پیاری معلوم ہوتی۔

جگدیپ نے اپنے سٹوڈیو کو دوبارہ سنوارا اور سجایا۔ گذشتہ برسوں میں فن پختگی سے اس کے ہاتھ مالا مال ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی اس کا کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ اس نے چچا کو خط لکھا کہ وہ چند روز کے لیے گاؤں آرہا ہے۔

چچی نے جگدیپ کی پیشانی چومتے ہوئے بڑے چاؤ سے کہا۔ "میں قربان جاؤں۔"

جگدیپ کو ایک بار تو یوں محسوس ہُوا جیسے وہ چودہ برس کے بن باس کے بعد اجودھیا واپس آیا ہو۔

"سناؤ چچی ـــــ تمہارا کیا حال رہا؟" جگدیپ نے بار بار پوچھا۔

"شاید تیرا منہ دیکھنے کے لیے ہی زندہ رہ گئی ہوں ـــــ ورنہ پنجاب کا جو حال ہُوا ـــــ توبہ ہی بھلی"

"کیا ہمارے گاؤں میں بھی کچھ ہُوا ـ ؟"

"تم عمر بھر ناداں ہی رہو گے ـــــ ہمارے گاؤں میں دیوتا تو نہیں رہتے تھے"

"یہاں تو کیا ہندو کیا مسلمان سب بھائیوں کی طرح رہتے تھے"

"سب جگہ بھائیوں کی طرح رہا کرتے تھے ـ مگر سب کے سروں پر بھوت سوار ہو گیا"

"کوئی بری بات تو نہیں ہُوئی ـ ؟"

"کیا تو نے گاؤں میں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی بھی دیکھا ہے؟ نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آ گئے ہیں ـــــ یہاں کے لوگ اُجڑ کر اُدھر جا بیٹھے ہیں اور اُدھر کے لوگ یہاں آ گئے ہیں"

اچانک جیسے کوئی اپنے قدموں میں سانپ دیکھ لے بالکل اسی طرح جگدیپ کو ایک خیال آیا اور اُس نے ڈرتے ہُوئے چچی کے منہ کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے دیپ ـــــ"

"چچی بیگماں ـــــ ؟"

"بیگماں بیچاری نہ جانے کہاں دھکے کھا رہی ہوگی ـــــ یہاں سے تو بال بچوں سمیت خیر و عافیت سے چلی گئی تھی ـــــ تیرے چچا اور دو آدمی اسے ساتھ کے گاؤں میں پہنچا آئے تھے ـــــ اس سے آگے اگر تقدیر اچھی رہی ہوگی تو کسی نہ کسی ٹھکانے پر پہنچ گئی ہوگی ـــــ بھگوان ہی باتیں بھگوان ہی جانے"

"بال بچے ۔؟"

"نوراں اور اس کا خاوند بھی مر گئے ـــــ نوراں کے دو بچے تھے ـــــ"

"اچھا تو وہ یہاں سے جا چکے ہیں ۔"

"پاگل نہ ہو تو ـــــ یہاں رہ کر انہیں کیا اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا تھا ؟ ایک دن تو وہ بمشکل بچے تھے ـــــ کسی نے ان کے گھر میں آگ لگا دی تھی ۔"

"آگ ـــــ ؟"

"جا کر ذرا دیکھ تو سہی ـــــ مکان کھلا پڑا ہے ـــــ ہاں سچ ـــــ"

"کیا ہے چچی ـــــ"

"گھر کے پیچھے برگد کا جو پیڑ تھا وہ تو نے اور نوراں نے لگایا تھا ۔"

جگدیپ سے بولا نہ گیا ۔

"پچھلی دیوار جب گری تو برگد کا وہ پیڑ بھی گر لیا ـــــ"

جگدیپ کو یوں محسوس جیسے اس کا رواں رواں کانپ رہا ہو ۔

"جاتے ہوئے نوراں میرے گلے سے لگ کر نہ پوچھو کتنا روئی ـــــ کہنے لگی گھر کے جلنے کا غم نہیں ـــــ اب مجھے کون سا یہاں لوٹ کر آنا ہے ۔ لیکن کاش برگد کا پیڑ نہ گرتا ـــــ وہ دیپ کی نشانی تھا ـــــ"

اب جگدیپ کے دل میں رکا ہوا طوفان بہہ نکلا ـــــ ازل سے نادان بچے کی طرح وہ چچی کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا ـــــ جگدیپ کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی عمر میں کبھی رویا بھی تھا ـــــ آج اسے یوں محسوس ہوا ۔ جیسے اس نے یہ طوفان اپنے دل میں برسوں سے رکا ہوا تھا ۔

"یہ قیامت کسی ایک پر نہیں بیتی ہے دیپ ـــــ سب پر گزری ہے۔"

چچی بار بار دیپ کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتی اور کہتی ـــــ "جو لوگ ادھر سے آئے ہیں اور جو کہانیاں وہ سناتے ہیں سن کر پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے ـــــ تیرے ماموں کی پہلے ہی جالندھر تبدیلی ہو گئی تھی۔ نہیں تو نہ جانے اس کا بھی کیا حال ہوتا۔ سنا ہے لاہور میں کچھ کم نہیں ہُوا۔

شام کو جگدیپ نے ہاتھ منہ دھویا ـــــ چچی نے اسے کچھ کھلایا پلایا۔ جگدیپ کو ایسا محسوس ہُوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز دم توڑ چکی تھی ـــــ کھانے کی بھوک اور زندہ رہنے کی بھوک ختم ہو چکی تھی۔

جگدیپ کے قدم رُک نہ سکے ـــــ ایک موڑ سے گزر کر اس نے دوسرا موڑ پار کیا۔ اس نے بیگماں کے منہدم مکان کو پہچان لیا۔ اس منہدم مکان پر بھی چھپر ڈال کر کچھ لوگ وہاں رہ رہے تھے۔ وہ دروازے کے آگے سے گزر گیا اور پچھواڑے پہنچا ـــــ پاگلوں کی طرح اس کا جائزہ لیتا رہا۔ جیسے کوئی کھوئی ہوئی سوئی ڈھونڈ رہا ہو۔

ماں کے ہاتھوں کی چھاؤں کی کسی کو ضرورت نہیں تو راں ـــــ یہ مسلمانوں کو ـــــ نہ ہندؤں کو ـــــ اس کے دل میں بیٹھا ہُوا جیسے کوئی کہہ رہا تھا ـــــ

سارے کشمیر میں گھوم پھر کر جگدیپ جب اچھابل پہنچا تو اس کے دل کو کچھ سکون نصیب ہُوا ۔۔۔ بہت سے لوگوں کو شاید یہاں زیادہ رونق نظر نہیں آتی تھی لہٰذا وہ آتے تھے اور چلے جاتے تھے لیکن جگدیپ کو یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ مقام اسے اپنے قریب آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ بہت سے کمروں پر مشتمل ایک بلڈنگ تھی۔ تھوڑے سے کرائے پر اسے ایک کمرہ مل گیا تھا ۔۔۔ کمرے کے سارے پردے گرا کر وہ کھڑکی کھول لیتا اور گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا۔ کبھی اس کے جی میں آتا کہ وہ قدرت کی بھری ہوئی گود میں گُم ہو جائے ۔۔۔ اس کی وسعت میں کھو جائے۔ اس کی ہریالی سے ڈھانپ دیا جائے ۔۔۔ کبھی اس سے اس قدر حسن و جمال برداشت نہ ہوتا ۔۔۔ وہ پھولوں اور پتیوں کو چھو نہ سکتا۔ حسن کی وسعت سے جیسے ڈر جاتا اور کھڑکی میں بیٹھ کر اسے دور سے دیکھتا رہتا۔

ایک دن باغ کی جھیل کے کنارے بیٹھا ہُوا جگدیپ کاغذوں اور رنگوں میں ڈوبا ہُوا تھا ۔۔۔ اسے جھیل کے پانی میں ایک پرچھائیں لہرتی ہوئی نظر آئی ۔۔۔ ایک نہایت ہی حسین و جمیل بُت تھا۔ جگدیپ کا جی چاہا وہ پیچھے مُڑ کر دیکھے کہ وہ پرچھائیں کس کی تھی ۔۔۔ اس کے بعد اُسے یوں محسوس ہُوا کہ اُس نے اگر مُڑ کر دیکھا تو پرچھائیں

والی لڑکی وہاں سے چلی جائے گی اور پھر پانی میں اس کی پرچھائیں نہیں پڑے گی —— اس کے سامنے پھیلی ہوئی جھیل ویران ہو جائے گی —— وہ اپنے کاغذوں پر جھکا رہا اور جھیل کے پانی اور جھیل میں لرزتی ہوئی پرچھائیں کو اپنے کاغذ پر اتارتا رہا۔

ہلکے ہلکے رنگ اس کے کاغذ پر پھیلتے جا رہے تھے —— جھیل کے پانی اور اس تیرتی ہوئی پرچھائیں کو جب اس نے کاغذ پر محفوظ کر لیا تو اسے اس پرچھائیں کے گم ہو جانے کا خطرہ نہ رہا لہٰذا اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا —— پھولوں کے لدے ہوئے درخت کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی۔

کسی تصویر کے رنگوں میں جیسے جان پڑ جائے — وہ لڑکی اس کے تصوّر کی طرح حسین تھی۔ اس کی نگاہیں دور پیڑوں کے جھنڈ میں کھوئی ہوئی تھیں۔ پہلگام کے خیموں میں رہتے ہوئے اس نے بہت سے لوگ دیکھے تھے —— برتنوں کی کھنک اور پارٹیوں کی چہل پہل میں اس نے مسرور عورتیں دیکھی تھیں —— گھوڑوں پر لمبی سیر پر نکلی ہوئی خوش اور دلکش لڑکیاں دیکھی تھیں —— گل بوٹوں کے جھرمٹ میں ناش کھیلتی ہوئی اور ہنستی ہوئی دوشیزائیں رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے گروہ بنا کر چلتی ہوئی عورتیں اور کشمیر کی سیر کو آئے ہوئے پریوار اس نے دیکھے تھے۔ مگر ان میں سے کوئی بات نظر نہیں آئی تھی۔

آج جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ لڑکی اس دھرتی کے رہنے والی نہیں تھی۔ گذشتہ ایک گھنٹہ سے وہ ویسے ہی وہاں بے خیالی کے عالم میں کھڑی تھی جیسے پھولوں کے باغ میں چپ چاپ پھولوں کی ایک اور بیل اُگ آئی ہو اور اپنے گرد و پیش میں اس طرح رچ گئی ہو کہ وہ باقی پھولوں سے الگ نہ ہو۔

دل میں غم و اندوہ کا طوفان لیے ہوئے جگدیپ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا —— کبھی وہ

دوسرے پیڑوں کی طرح دیکھتا اور کبھی ایک پیڑ کی طرح اُگی ہوئی اس لڑکی کو دیکھتا اور پھر جگدیپ نے ایک نوجوان کو وہاں آتے دیکھا ــــ اس نے لڑکی کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکی نے چونک کر اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ــــ پھر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔

جگدیپ نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی تصویر کو ٹٹولا وہ وہیں تھی ــــ جگدیپ نے ٹکٹکی باندھ کر تصویر کی طرف دیکھا کاغذ پر جھیل کا پانی اور پانی میں لرزتی ہوئی پرچھائیں وہیں تھی کہیں چلی نہیں گئی تھی۔

رات کو جب جگدیپ اپنے کمرے میں سونے کے لیے آیا تو اس کی نگاہ باقی کمروں پر بھی پڑی۔ اس کے کمرے سے تین کمرے چھوڑ کر جو کمرہ تھا اس میں وہ لڑکی اور اس کا ساتھی وہ نوجوان جو شاید اس کا خاوند تھا قیام پذیر تھے۔

دوسرے دن باغ میں اس نے دو تین آدمیوں کو باتیں کرتے ہوئے سُنا۔

"دیکھا یہاں آئی ہوئی ہے ــــ اس کے ساتھ اس کا خاوند بھی ہے"

جگدیپ نے ریکھا کا نام سُن رکھا تھا۔ اسے بہت کم ادیب پسند آئے تھے۔ کہانیوں سے زیادہ شعر و شاعری اس کے لیے زیادہ کشش رکھتی تھی۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ جب کوئی نظم یا شعر اسے اپنی رگ و پے میں اترتا ہوا محسوس ہوا کرتا تھا ــــ اسے اپنے ملک کے جو ادیب پسند تھے ریکھا ان میں سے ایک تھی ــــ اس نے ریکھا کی کچھ کتابیں خرید کر بھی اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں ــــ " وہی ریکھا ہوگی ضرور وہی ہوگی جس لڑکی کو میں نے کل دیکھا تھا وہ ریکھا کے سوا کوئی دوسری لڑکی نہیں ہو سکتی ــــ جگدیپ کا دل اس سے کہہ رہا تھا۔

اس دوپہر کو جگدیپ نے ریکھا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا ـــــ ریکھا اپنے کمرے ہی میں تھی ـــــ اس کا خاوند بھی وہیں تھا ـــــ دونوں نے بڑے احترام اور تپاک کے ساتھ جگدیپ کو اندر آنے کی دعوت دی۔

"میرا نام جگدیپ ہے۔"

"جگدیپ ـــــ مصور؟"

"آپ نے کیا میرا نام سن رکھا ہے؟"

"حیرانی اس بات پر نہیں ہے ـــــ حیرانی تو جب ہوتی اگر نہ سنا ہوتا۔"

"شکریہ۔"

"کئی بار نمائشوں میں آپ کی تخلیقات بھی دیکھی ہیں ـــــ چند روز کی بات ہے ایک اخبار نے آپ کی بنائی ہوئی کتنی ہی تصویریں شائع کی تھیں۔

"آپ میرے پسندیدہ ادیبوں میں سے ہیں ـــــ اس وقت بھی میرے کمرے میں آپ کی دو کتابیں پڑی ہوئی ہیں۔"

"کیا اب میں آپ کا شکریہ ادا کروں ـــــ؟"

سب ہی ہنس پڑے ـــــ جگدیپ کو ریکھا کا پتی بھی بہت اچھا لگا۔ اس کے رویہ میں قطعاً بیگانگی نہیں تھی ـــــ آنے سے پہلے جگدیپ جھجکتا رہا تھا ـــــ ریکھا سے نہیں بلکہ اس کے خاوند سے ـــــ لیکن وہ تو ریکھا سے بھی کہیں زیادہ بے تکلف تھا ـــــ اس نے اپنے نوکر کو آواز دے کر چائے منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے جگدیپ کے لیے چائے کی پیالی بنائی۔

"یہاں آپ کتنے دن رہیں گے؟" جگدیپ نے ریکھا کے خاوند سے پوچھا۔

ریکھا کو سارے کشمیر میں یہ جگہ بہت پسند آئی ہے — ہمیں جتنے روز بھی رہنا ہُوا یہیں رہیں گے —" ریکھا کے خاوند نے جواب دیا۔

جگدیپ کل والا خاکہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر یہ خاکہ دکھانا موزوں ہُوا تو دکھاؤں گا ورنہ واپس اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ لیکن جب یہ خاکہ دکھانے میں جگدیپ کو جھجک محسوس نہ ہوئی۔

"کل آپ جھیل کے کنارے بہت دیر تک کھڑی رہیں"

"ہاں — وہاں کنارے پر کوئی شخص تصویریں بنا رہا تھا — کیا آپ ہی تھے —؟"

"آپ کی پرچھائیں پانی میں پڑ رہی تھیں — میں نے ایک اسکیچ تیار کیا تھا"

جگدیپ نے کاغذ کھولا — وہ کاغذ ریکھا کے پتی نے پکڑ لیا۔

"بہت پیارا ہے — بہت ہی پیارا —" اس نے کہا۔

"اس میں ریکھا جی کو پہچانا نہیں جاتا — صرف ایک پرچھائیں ہے"

"پرچھائیں زیادہ خوبصورت ہُوا کرتی ہے — ریکھا کا پتی بولا۔

"آپ اگر اجازت دیں تو میں کسی دن ان کا اسکیچ بنا دوں"

"ضرور — ضرور —"

چائے ختم ہو گئی — جگدیپ جب وہاں سے چلنے لگا تو ریکھا نے کہا — یہاں کشمیر آکر آپ نے بہت سی تصویریں بنائی ہوں گی — کسی دن وہ دکھایئے —؟

"جس دن آپ کا جی چاہے — آپ کے کمرے سے چوتھا کمرہ میرا ہے —

دوسرے دن اور پھر اس سے اگلے دن ریکھا اور اس کا پتی اس کے کمرے میں

آگئے ۔ جگدیپ نے ریکھا کا اسکیچ تیار کر دیا ــــ سادہ سی پنسل ڈرائنگ تھی اور پھر جگدیپ نے کہا "میں کچھ دن صرف کر کے آپ کی رنگین تصویر بنا ؤں گا ۔"

"میری تصویر بنانے کی بجائے ــــ"

"ہاں ہاں کہیئے ــــ"

"بہت بڑی بات معلوم ہوتی ہے ۔"

"آپ کہیئے تو سہی ۔"

"اگر آپ میرے کسی گیت کے چند مصرعوں کو ــــ"

"جو مصرعے آپ کو پسند ہوں میں ان کے متعلق بھی تصویر بنا دوں گا ۔"

اور پھر ایک روز ریکھا نے جگدیپ کے کمرے میں آکر کہا ــــ "آج مجھے اپنی ساری تصویریں دکھایئے ــــ بشرطیکہ آپ کے پاس وقت ہو . . . . ."

"وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے ؟"

"رات کو تار آیا تھا اور وہ چار پانچ روز کے لیے جموں چلے گئے ہیں ۔"

"آپ اکیلی رہیں گی ۔ ؟"

"ڈر کی کوئی بات نہیں ــــ پرانا نوکر پاس ہے ــــ بہت ہی بھلا آدمی ہے ۔

اور پھر چار پانچ روز تک وہ بھی لوٹ آئیں گے۔"

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ــــ"

"آپ نزدیک ہی تو رہتے ہیں ــــ اگر کوئی ضرورت ہوئی تو ــــ"

جگدیپ نے اپنا سوٹ کیس کھولا۔ کئی تصویریں تو باہر ہی پڑی تھیں سارا کمرہ کاغذوں سے بھرپڑا تھا ــــ میز پر کاغذ ــــ کرسیوں پر کاغذ ــــ پلنگ پر کاغذ۔ ایک تصویر جگدیپ نے دیوار پر ٹانکا رکھی تھی ــــ یہ سب تصویریں ریکھا نے دیکھ رکھی تھیں ــــ آج جگدیپ اسے سوٹ کیس میں حفاظت سے رکھی ہوئی تصویریں دکھانے لگا ــــ!

"دیوار پر ٹنگی ہوئی یہ تصویر جس کے نیچے "سپنا" لکھا ہوا ہے کس کی ہے۔؟"

جگدیپ نے اس سوال کا فوراً جواب نہ دیا۔ کچھ سنبھل کر بولا ــــ "نوراں کی ہے۔"

"کون نوراں ــــ کہاں تھی ــــ؟"

ریکھا جیسی لڑکی کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی ــــ جگدیپ کی جھکی جھکی نگاہوں نے جو داستان سنائی ریکھا نے وہ سُن لی۔

"کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ تحریر کا ذریعہ اظہار بہت بیگانہ سا ہے۔"

"مکمل تو کوئی بھی ذریعہ اظہار نہیں ــــ آپ اپنے باطن سے چاہے کتنا ہی کچھ کیوں نہ باہر نکال لائیں ــــ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بات بنی نہیں۔"

"یہی تو ایک بات ہے جو بار بار لکھنے پر مجبور کرتی ہے ــــ بار بار ارتقا کا تقاضہ کرتی ہے ــــ لیکن لفظوں کا سہارا بہت ہی بیگانہ معلوم ہوتا ہے اور بہت ہی۔"

"کچھ تحریریں ایسی بھی ہوتی ہیں جو آدمی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔"

"مجھے اپنے کسی کسی مصرعے پر بہت اطمینان ہوتا ہے لیکن کبھی بالکل اطمینان نہیں ہوتا ـــ جیسے لفظوں کی گرفت میں کچھ بھی تو نہ آ رہا ہو۔"

"آپ نے ایک دن کہا تھا کہ میں آپ کے چند مصرعوں کی ـــ آپ کو کونسے مصرعے پسند ہیں ۔؟"

"ایک بھی پسند نہیں ـــ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہ لکھوں ـــ لکھنا مجھے ـــ"

"آپ کیا کہنے والی تھیں ـــ؟"

"کچھ نہیں ۔"

ناقابلِ شکست سکوت مسلط ہو گیا ـــ پھر جگدیپ کو ایک سہارا ہاتھ لگا اور اس نے کہا ـــ "آپ کا وہ مصرعہ ــــــ

دل میں دیا جلا کر کوئی جب بھی سانس لیا کرتا ہے ۔؟"

"اس میں تصویر سے خطاب کیا ہے ۔"

"ہاں ـــ"

"ہماری دنیا میں تصوّر کے کوئی معنی نہیں ہیں ۔ دنیا پہاڑے کی طرح ہے جسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے ـــ لیکن تخلیق کے معنی کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی ناپے جا سکتے ہیں ۔"

مگر ہم دو پاگل ہو گئے ہیں ـــ تصوّر کے سہارے ہی جیئے جاتے ہیں ۔"

جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کا طوفان کبھی رکا نہیں تھا ـــ اس

کے بدن کو اس طوفان کے تھپیڑے لگتے رہے تھے۔ لیکن کبھی کبھی جب وہ کوئی تصویر بناتا تھا تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ طوفان پر کوئی پل بن گیا ہے۔ جس پر کھڑا ہو کر وہ سیلاب کی وسعتوں کو دیکھ سکتا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے لہروں کے تھپیڑوں سے بچ سکتا تھا۔

لیکن اس وقت جگدیپ کو یوں لگا کہ اس کے فن کا پل بھی ٹوٹ گیا ہے اور پانی کی لہروں میں اس کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں ۔۔۔ ریکھا نے یہ کیا کہا تھا ۔۔۔ تخیل آپ کے دل میں ایک سوال رکھ دیتا ہے جس کا جواب شاید کوئی نہیں ہوتا۔ جگدیپ سوچا کرتا تھا کہ یہ سوال جیسے اس کے دل ہی میں کھٹکتا رہا تھا۔۔۔ صرف اس کے دل میں کھٹکتا رہا تھا ۔۔۔ آج اسے پتہ چلا کہ یہ سوال ریکھا کے دل میں بھی کھٹک رہا تھا اور پھر نہ جانے اس جیسے اور ریکھا جیسے کتنے اور لوگ بھی تھے جن کے دلوں میں یہ سوال کسمسا رہا ہوگا اِس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے وہ شعر کہتے ہوں گے ۔ کسی کو بھی اس سوال کا جواب نہ ملتا تھا ۔۔۔ کوئی بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا ۔۔۔ یہ سوال کہاں سے دل میں آتا تھا ۔۔۔ کہاں سے پیدا ہوتا تھا ۔۔۔ یہ سوال کہاں سے وجود میں آتا تھا اور کیوں آتا تھا ۔۔۔

"مجھے کچھ کہنا نہیں آتا ۔۔۔ صرف سوچنا آتا ہے ۔۔۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ۔۔۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں جو کچھ سوچتا ہوں آپ وہی کچھ کہتے ہیں ۔۔۔ یہ سوال ہمارے دلوں میں کیوں پیدا ہوتا ہے ۔؟"

"مجھے آج تک پتہ نہیں چلا ۔۔۔ میں جو کچھ پڑھتی ہوں ۔۔۔ میں جو کچھ لکھتی ہوں ۔۔۔ یہ سوال اور بھی بڑا ہوتا جاتا ہے اور مجھے اس کا جواب نہیں ملتا ۔۔۔"

"لوگ آپ جیسے ادیبوں کے لیے ہی تو کہتے ہیں کہ آپ کے پاس زندگی کے مسئلہ کا حل ہوتا ہے ---!"

یہ "حل" کا لفظ مجھے مذاق معلوم ہوتا ہے --- میں جوں جوں دیکھتی ہوں میرے دل کا خلاء بڑھتا جاتا ہے --- ہر لمحہ طویل ہوتا جاتا ہے --- جیسے سارے الفاظ اور ساری باتیں آپ کے گرد شور مچا رہی ہوں --- آپ کی شہرت اور آپ کی مقبولیت بھی آپ کو محض ایک غل غباڑہ نظر آتی ہے ---"

ریکھا جیسے ہانپ گئی تھی --- وہ تمام تصویروں کو الگ رکھ کر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس کی نظر سامنے درختوں کے جھنڈ میں کھوئی ہوئی تھی۔

"مجھے آپ اپنی ایک ایسی چیز سنایئے جو آپ کو کبھی کبھی اچھی معلوم ہوتی ہو ---"

جگدیپ نے بہت دیر کے بعد ریکھا کے پاس کھڑکی میں آ کر کہا۔

"دو چار مصرعے ہیں --- کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ان میں کوئی بات کہی ہے۔"

جگدیپ خاموش رہا اور ریکھا نے آہستہ سے یہ مصرعے پڑھے:

یہ میری شب بیدار ہے اور یاد تیری سو گئی
سورج کا رتھ بیکس ہوا کرنیں کسی نے لوٹ لیں
پھینکا کسی نے چاند کا گوٹا فلک سے نوچ لیا
یہ میری شب بیدار ہے اور تیری یاد سو گئی

اس کے بعد نہ جگدیپ نے اور نہ ہی ریکھا نے کچھ کہا گیا۔ نہ جانے کتنے لمحے گذر گئے --- جگدیپ نے ایک بار صرف اتنا کہا۔ "میرے پاس الفاظ نہیں ہیں --- میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اس رات کو جب جگدیپ اپنے کمرے میں تھا تو اس پر نیند طاری تھی۔ لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بیدار ہو ـــــ سامنے چاندنی چھٹکی ہوئی تھی ـــــ چاندنی کا ایک بُت تھا اور اس کی شکل ایک پیڑ کی طرح تھی ـــــ پھر اس درخت سے جیسے ایک ٹہنی ٹوٹ کے گر پڑی ـــــ اس جگہ اندھیرا ہو گیا ـــ پھر دوسری ٹہنی گری اور پھر تیسری۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاندنی کی ٹہنیاں ٹوٹتی چلی گئیں ـــــ تاریکی بڑھتی گئی اور پھر اندھیرے میں ایک سیاہ اور دیو قامت پیڑ اس جگہ کو ڈراؤنا اور بھیانک بنانے لگا۔ پھر جگدیپ نے دیکھا اس کے سامنے حسین اور نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا چاند پر بھرپور جوبن تھا ـــــ اور پھر کسی نے اپنے ناخنوں سے چاند کو نوچنا شروع کر دیا ـــــ جگدیپ نے گھبرا کر کمرے کی بتی روشن کر دی ـــــ وہاں اس کے چاروں طرف رنگ برش اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ نہ ٹوٹی ہوئی کرنیں تھیں اور نہ ادھڑا ہوا چاند تھا ـــــ جگدیپ نے ریکھا کا جو سکیچ بنایا تھا اس کی طرف دیکھا ـــــ وہ ایک خاموش سیدھی سادی گمبھیر لڑکی تھی ـــــ کون جانے اُس نے سُورج کے رکھ سے کرنیں ٹوٹتی ہوئی دیکھی ہوں۔ اور کون جانے اُس نے آسمان کی پوشاک پر سے چاند کا گوٹا کنارہ ادھڑتا ہُوا دیکھا ہو۔ جگدیپ کو ایسا محسوس ہُوا جیسے اس کے دل کا سوال پھیل کر بڑا ہو گیا تھا ـــــ اور بھی بڑا ہو گیا تھا۔

پانچ روز گزر گئے ـــــ ریکھا کے خاوند کا تار آیا کہ وہ اتنا مصروف ہے کہ واپس نہیں آ سکتا۔ اس لیے وہ نوکر کے ہمراہ جموں چلی آئے۔

ریکھا نے جب اپنا سامان باندھا جگدیپ نے آ کر کہا ـــــ سری نگر سے بس پکڑنے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہ ہو گی ـــــ؟ اگر اجازت دیں تو میں آپکو سری نگر تک چھوڑ آؤں"۔

"اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ـــــ" ریکھا نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا۔

جگدیپ ریکھا کو چھوڑنے کے لیے سری نگر چلا گیا۔

سری نگر پہنچ کر پتہ چلا کہ بسوں کی آمد و رفت بند تھی ـــــ بارش سے اُدھر سڑک ٹوٹ گئی تھی۔

جگدیپ نے ایک نہایت اچھے ہاؤس بوٹ میں ریکھا کی رہائش کا انتظام کر دیا اور ایک چھوٹا ہاؤس بوٹ آپ لے لیا۔ پتہ چلا کم سے کم تین دن تک آمد و رفت نہیں کھل سکے گی۔

اس رات کو جگدیپ اپنے ہاؤس بوٹ میں سو یا پڑا تھا تو اس نے دیکھا کہ ریکھا اُس کے پلنگ سے تھوڑی دور کھڑی ہے ـــــ ریکھا کا چہرہ حسین تھا اور وہ ایک دیوی نظر آ رہی تھی ـــــ ریکھا کی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی ـــــ وہ اس سے آنکھیں چار نہ کر سکا ـــــ اس نے لجاجت آمیز لہجہ میں کہا ـــــ "بیٹھ جائیے۔"

ریکھا خاموش رہی ـــــ بدستور اپنی جگہ پہ کھڑی رہی ـــــ اور پھر ریکھا کی دھیمی سی آواز سنائی دی ـــــ "میں نوراں کیسے بن جاؤں ـــــ؟"

جگدیپ چونک پڑا اور اٹھ بیٹھا ـــــ کتنا انوکھا خواب تھا ـــــ اس رات کو جگدیپ پھر سو نہ سکا۔

دوسرے دن جگدیپ جب ریکھا سے ملا تو وہ اپنے اچنبے پر قابو پا چکا تھا ریکھا کے ساتھ بیٹھ کر اُس نے کھانا کھایا اور پھر وہ باقی دن گذارنے کے لیے شکارے میں بیٹھ کر ڈل کے کنارے آ گئے اور ایک باغ میں چلے گئے۔

باتیں کرنے کی جیسے ضرورت ہی ختم ہو چکی تھی ـــــ یا ضرورتاً اتنی بڑھ گئی تھی کہ

باتیں کرنا یا نہ کرنا ان کے لیے ایک ہی بات تھی ـــــ کافی دیر تک دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی ـــــ ریکھا کو بیٹھنے کے لیے زرد پھولوں والے پیڑ کی چھاؤں بھلی معلوم ہوتی ۔

"وہاں بیٹھ جائیں ۔؟"

"ہاں ـــــ"

"کیا آپ پہلے بھی اس جگہ آئے ہیں ـ ؟"

"مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں آج سے پہلے کہیں بھی نہیں گیا ـــــ"

جگدیپ نے سنجیدگی سے کہا ـــــ ریکھا نے ایک بار اس کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے آپ تھک گئے ہیں ـــــ ذرا آرام کر لیجیے ـــــ ریکھا نے کافی دیر کے بعد کہا ۔

ریکھا کے نیچے جیسے زرد پھولوں کا قالین بچھا ہوا تھا ـــــ جگدیپ نے درخت کے تنے سے اپنی پیٹھ لگا دی اور کہا :

ہوا سے کوئی نہ کوئی پھول ٹوٹ کر گر پڑتا ہے ـــــ میرا جی چاہتا ہے اتنے پھول گریں میں ان میں دفن ہو جاؤں ـــــ پھولوں کی ایک قبر بن جائے اور میں قبر میں سویا رہوں "۔

ریکھا خاموش رہی ـــــ پھول گرتے رہے ـــــ جگدیپ پر بھی اور ریکھا پر بھی ۔

دوپہر کی دھوپ میں شام کا اندھیرا گھل گیا ۔

"کیا چلیں ـــــ ؟"

"چلو ـــــ"

گھنٹوں کے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کی آواز سُنی ـــــ

بارہ دری کی پتھر سے بنی ہوئی دیواروں کو لوگوں نے کُھرچ کُھرچ کر اپنے نام کندہ کر دیے تھے ـــــ جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے نگاہوں کے قدموں میں کنکر آ گئے ہوں ـــــ!

"اِس طرح اپنا نام لکھنے میں شاید کسی کو اطمینان ہوتا ہو ـــــ" جگدیپ نے کہا۔ "بیچارے لوگ ـــــ دلوں کی دیوار پر نام کندہ نہیں کر سکتے ـــــ زمانہ کی دیوار پر نام ثبت نہیں کر سکتے ـــــ جھوٹی تسلیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں ـــــ"

ریکھا نے آہستہ سے کہا ـــــ باغ سے لوٹتے ہوئے ریکھا سرو کے ایک پیڑ کے پاس کھڑی ہو گئی ـــــ سرو کے پتوں کو کافی دیر تک اپنی مٹھی میں رکھنے کے بعد انہیں چھوڑ دیا ـــــ ان پتوں سے لگے ہوئے سبز سبز دانے توڑ کر اپنی دونوں مٹھیاں بھر لیں ـــــ باغ سے باہر آنے پر ریکھا نے اپنی مٹھیاں جگدیپ ہتھیلیوں پر انڈیل دیں ـــــ جگدیپ نے سارے دانے اپنی جیبوں میں ڈال لیے۔

ریکھا کو اس کے ہاؤس بوٹ میں چھوڑ کر اور کھانا کھا کر جگدیپ جب اپنے ہاؤس بوٹ میں آیا تو اس نے جیب سے سارے دانے نکال کر میز پر رکھ دیے اور پھر نہ جانے اِسے کیا خیال آیا اس نے اپنے سوٹ کیس میں سے سوئی اور دھاگا نکالا اور ان کی ایک مالا بنا دی۔

•

دوسرا دن ریکھا اور جگدیپ نے جس باغ میں گزارا اس کے کنارے بارہ دری کا ایک گوشہ ابھی تک ثابت کھڑا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر جب ریکھا اور

جگدیپ اوپر گئے تو اس کا ایک گوشہ ایک چھوٹی سی کھڑکی کی طرح تھا — اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر جگدیپ چونک پڑا — گزشتہ رات کو جگدیپ نے خواب دیکھا تھا کہ ایک گھنے جنگل میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے — سرکنڈوں کی چھت اور مٹی سے لیپی پوتی ہوئی دیواریں — وہ اور ریکھا دونوں اس جھونپڑی میں کھڑے ہو کر ارد گرد پھیلے ہوئے گھنے جنگل کو دیکھ رہے تھے۔ جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا کہ ٹوٹے ہوئے پتھروں کی اس بارہ دری کا یہ گوشہ ایک جھونپڑی تھا جہاں وہ ریکھا کے پاس کھڑا ہوا گھنے جنگل کی طرف کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو —" ریکھا نے آہستہ سے پوچھا —

"آج مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ایک ہی دن میں سن رسیدہ ہو گیا ہوں۔"

جگدیپ نے اس کے سوا کچھ نہ کہا۔

اس شام کو جب ریکھا اور جگدیپ واپس آئے تو ان کا کہیں بیٹھ کر چائے پینے کو جی چاہا۔

ایک اچھا ہوٹل نظر آیا — اندر گئے — ان کی خواہش تھی کہ ہوٹل میں زیادہ بھیڑ نہیں ہونی چاہیئے — کمرے میں لوگوں کا ہجوم تھا — ایک طرف میز خالی پڑی تھی — وہ اس کے گرد جا بیٹھے — چائے ابھی تک نہیں آئی تھی۔ لیکن لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف پہلے ہی آ گئی تھیں۔

جگدیپ اور ریکھا نے لاکھ کوشش کی کہ انہیں چائے کی پیالیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے لیکن آپس میں باتیں کرتے ہوئے بھی انہیں کوئی نہ کوئی دبی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی — ریکھ... شاعرہ — اور اپنے خیالات میں محو۔ جگدیپ اور ریکھا

کو لوگوں کی نگاہیں اپنے بدن پر چبھی ہوئی محسوس ہوتیں۔

چائے کی پیالی ختم ہوتے ہی ریکھا اٹھ کر کھڑی ہو گئی — جگدیپ نے اپنی پیالی آدھی خالی چھوڑ دی — چائے کا بل ادا کیا اور وہ دونوں باہر آ گئے۔

شکارے میں بیٹھ کر جب وہ دونوں ہاؤس بوٹ میں واپس آئے تو ریکھا نے کہا — "عورت ہونا بھی ایک مصیبت ہے — بہت بڑی مصیبت"

اگلے روز ریکھا کو وہاں سے چلے جانا تھا — اس رات کو جگدیپ سو نہ سکا — ذرا سی دیر کے لیے آنکھ لگتی تو اسے ریکھا کا چہرہ دکھائی دینے لگتا اور پھر دیکھتے دیکھتے اس کا چہرہ نوراں کے چہرے میں تبدیل ہو جاتا — جگدیپ چونک کر آنکھیں کھول کر دیکھتا — اٹھ کر کافی دیر تک ہاؤس بوٹ کی بیس کھڑا رہتا — باہر ڈل کا پانی بھی پُرسکون نہیں تھا — جیسے اس کے پیروں کو ٹکنے کے لیے جگہ نہ مل رہی — جگدیپ پھر اپنے پلنگ پر آ جاتا — ذرا سی دیر کو آنکھ لگتی — نوراں کا بھولا اور معصوم چہرہ اس کے سامنے آ جاتا اور پھر اس کے معصوم چہرے پر ویران متانت پھیل جاتی۔ اور وہ چہرہ ریکھا کا بن جاتا۔

صبح ہوئی تو جگدیپ ریکھا کے ہاؤس بوٹ میں پہنچا — ریکھا اپنا سامان باندھ رہی تھی۔

"کیا میرا اسکیچ مجھے نہیں دیجیے گا —؟" ریکھا نے کہا۔

"میں ساتھ لے کر آیا ہوں"

"اور وہ دوسرا —؟"

"کون سا —؟"

بیل اور پرچھائیں والا "

" پرچھائیں میرے پاس ہی رہنے دیجیے "

ریکھا خاموش ہوگئی ـــــ سامان سمیٹتی رہی ـــــ نوکر نے میز پر چائے رکھ دی ۔ ریکھا نے دو پیالیاں بنائیں اور پلیٹ میں بھنے ہوئے بادام ڈال کر کہنے لگی ـــــ" زندگی کی چنگاری بڑی ظالم ہوتی ہے "

" سارا فن اسی باطنی چنگاری سے پیدا ہوتا ہے "

" جیسے زندگی کو فن عزیز ہو اور انسان عزیز نہ ہو "

" شاید ـــــ "

انسان چاہے ساری عمر اس چنگاری سے جلتا رہے ۔ زندگی فن کی تعمیر کرتی رہتی ہے ـــــ کون جانتا ہے کہ انسان کو فن کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ـــــ اس بات کا علم ہوتا ہے کہ دھوپ سے چمکتی ہوئی ریت پانی نہیں ہوتی لیکن زندگی ریت ہی کو پانی کی طرح جھلکا دیتی ہے ۔ انسان کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے ـــــ" ریکھا نے چائے کی دوسری پیالی بناتے ہوئے کہا ـــــ" کل رات کو مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے ریگستان میں چنبیلی کے پھول کھل اٹھے ہیں ۔

ہر طرف سفید کلیاں ـــــ جدھر بھی نگاہ اٹھے ـــــ دودھ جیسے سفید کلیاں دکھائی دیں ـــــ اور میں نے کلیاں توڑ توڑ کر اپنی جھولی بھر لی ـــــ اور پھر مجھے دکھائی دیا ـــــ بہت کچھ دکھائی دیا ـــــ میں صبح کو اٹھ کر لکھتی رہی ـــــ" ریکھا نے ایک کاغذ جگدیپ کے ہاتھ میں دے دیا ۔

جگدیپ نے پڑھا ۔

ورنہ اپنا بند کر اے زندگی

جذبِ دل کی لاج رکھ !
ریتیلے میدان سے آتی ہوئی
سن ذرا آوازِ پا سن تو سہی
زندگی اپنا نہ در د تو بند کر
کرے ایک پل کیلئے ہی انتظار
لاکھ اندھیرے پار کرتی چیرتی
آ رہی ہے روشنی کی ایک لکیر
ورنہ اپنا بند کر اے زندگی !

خیمۂ خستہ سے ویراں ایک جھونپڑی
انجم تاباں جلاتے ہیں آلاؤ !
چاند کے لب پر صلائے عام ہے
در دا پنا بند کر اے زندگی
دیکھ تو مڑ کر ذرا تو ایک بار
ماتھے پہ کرنوں کا سہرا باندھ کر
آگیا پھر آفتاب زر نگار
ورنہ اپنا بند کر لے زندگی

ایک لمحہ کے لیے اب رک بھی جا
عشق ہاتھوں میں ہے ایک کاسہ ا
زندگی تو بھیک اس میں ڈال

جگدیپ کا سر جھک گیا ــــ وہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کاغذ تک سرنگوں ہو گیا ۔

نوکر نے میز پر سے خالی پیالیاں اٹھالیں ــــ رخصت کی گھڑی آ گئی تھی ۔
کیا میں اسے رکھ لوں ــــ ؟ جگدیپ نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ طرف دیکھ کر کہا ۔

"ہاں ــ" ریکھا نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا ۔

"یہ میرے لیے زندگی کا پیغام ثابت ہوگا ۔"

"زندگی کا ہر ایک پیغام ایک فریب ہوتا ہے ــــ ایک چھلاوہ ــــ"

اس کے بعد دونوں خاموش رہے ــــ ہاؤس بوٹ کا کرایہ ادا کرنے کے بعد ریکھا اور جگدیپ لاریوں کے اڈہ پر آ گئے ــــ ریکھا کے لیے جگدیپ نے سیٹ ریزرو کروا رکھی تھی ــــ لاری چلنے کا وقت ہو گیا اور جب چل دی تو سڑک پر اُڑتی ہوئی دھول دیکھ کر جگدیپ کو یوں محسوس ہُوا جیسے آج دوسری بار وہ نوراں کو گم کر بیٹھا تھا ۔ !

اب کے جگدیپ نے چچی سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ کشمیر سے لوٹتا ہوا گاؤں آئے گا اور پھر دلّی جائے گا ۔۔۔ چچی نے اُس سے کہا تھا ۔

میری ویراں سے ملاقات ہوئی تھی ۔۔۔ وہ کسی کی شادی پر یہاں آئی ہوئی تھی ۔۔۔ تجھے بہت یاد کرتی تھی ۔"

"کیا خوش تھی ۔۔۔؟"

"بہت ۔۔۔ اس پر تو جیسے دوبارہ شباب آگیا ہے ۔"

"سچ ۔۔۔!"

"کہتی تھی ۔۔۔ میں دیپ کا احسان نہیں چکا سکتی ۔۔۔ اس نے تو مجھے نئی زندگی دیدی ہے ۔"

"کیا روپے پیسے سے اس کا ہاتھ تنگ تو نہیں تھا؟"

"نہیں ۔۔۔ کہتی تھی کہ انھوں نے پڑوس کے گاؤں میں کافی زمین خریدی ہے ۔ ہیروں جیسے دو بیٹے ہیں اس کے ۔۔۔ تجھے رہ رہ کر یاد کرتی تھی اور کہتی تھی دیپ سے کہنا کہ ایک بار مجھے آکر منہ تو دکھا جائے ۔"

"اچھا چچی کبھی ہو آؤں گا ۔"

اس وقت تو نوراں کے غم نے اسے کہیں نہ جانے دیا ــــ اب کشمیر سے لوٹتے ہوئے جگدیپ کو اپنا وعدہ یاد آیا اور وہ اپنے گاؤں چلا آیا۔

جگدیپ چار پانچ روز کے لیے اپنی چچی کے پاس رہا اور پھر چھوٹی شاہنی کے گاؤں کا پتہ پوچھ کر وہ اس سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ اِدھر اُدھر سے پوچھتے ہوئے اُس نے اس کا گھر ڈھونڈ لیا۔

"میں قربان جاؤں ــــ میرا دیپ۔!" شاہنی کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔"

"خیریت تو ہے شاہنی ــــ؟"

"مجھے شاہنی کہہ کر کیوں بلا رہا ہے ــــ میں تو تیری ویراں ہوں ــــ وہی ویراں ــــ"

"تو سچ مچ شاہنی ہے ویراں ــــ آدمی دل سے دولت مند ہوتا ہے"۔

"میں تو بھکارن تھی دیپ ــــ تو نے سیٹھانی بنا دیا۔"

ویراں نے دالان میں نواڑی پلنگ بچھا دیا ــــ اندر سے نئی اور کوری چادر بچھانے کے لیے نکال لائی۔

"تو نے تو مجھے بھلا ہی دیا دیپ ــــ!" ویراں دودھ کا گلاس لائی اور جگدیپ کے قریب آ کر بولی۔

"اتنی دور سے تجھے ملنے آیا ہوں ــــ بھلا کیسے دیا۔؟"

"سنا ہے اب تو بہت بڑا آدمی بن گیا ہے"۔

"ناپ کر دیکھ لو کہ میں کتنا بڑا ہو گیا ہوں"۔

"تو تو ویسا ہی دیپ ہے —— میں سوچتی تھی کہ اب تو ہم سے بات کرنا بھی گوارا کرے گا کہ نہیں۔"

"کیوں مجھے اب کیا ہو گیا ہے"۔

اب تو اخباروں میں تیری تصویریں چھپتی ہیں —— ہمارے گاؤں میں بھی اخبار آتا ہے —— جب میں نے پہلی بار تیری تصویر دیکھی تو سب کو دکھاتی پھروں "میرا دیپ —— میرا دیپ ——!" میں نے بڑی حفاظت سے ٹرنک میں رکھی ہوئی ہے"۔

"سچ جگدیپ ہنس پڑا۔

"میں پوچھتی ہوں کیا اب تو شادی نہیں کرے گا —— ؟ کیا بوڑھا ہو کر بیاہ کرائیگا؟"

"مجھ سے کوئی شادی کرواتا ہی نہیں۔"

"رہنے بھی دے —— تجھے باتیں بہت آتی ہیں —— یوں کیوں نہیں کہتا کہ کہ کوئی لڑکی تیری نظر پر چڑھتی ہی نہیں"۔

"سچ کہہ رہا ہوں نظر پر تو چڑھتی ہیں —— مگر"

"مگر کیا —— ؟"

"وہ لڑکیاں یا تو کسی اور سے بیاہ کر لیتی ہیں یا کسی نے پہلے ہی سے شادی کر رکھی ہوتی ہے —— "جگدیپ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"تو باتیں بہت بناتا ہے —— شہر میں رہ کر تجھے بہت باتیں آ گئی ہیں۔"

"تجھے بھی تو آ گئی ہیں —— پہلے تو بات نہیں کیا کرتی تھی۔"

"چل ہٹ —— "ویراں شرما گئی۔

"بچے کہاں ہیں۔؟
"تجھے یہ کس نے بتایا کہ ۔۔۔" ویراں حجاب کے مارے سُرخ ہوگئی۔
"اچھا یہ تو بتا تیرے بچے رشتہ میں میرے کیا ہوئے۔؟ جگدیپ نے از راہِ مذاق پوچھا۔
"میں نے تیری تصویر انہیں دکھائی تھی اور کہا تھا یہ تمہارا ماموں ہے ۔۔۔" ویراں کی ہنسی نکل گئی۔
"کون سے رشتہ سے میں ان کا ماموں ہوا ۔۔۔؟" جگدیپ نے آہستہ سے ویراں کی پیٹھ پر ٹکے مارتے ہوئے کہا۔
"بس بیٹھا بھی رہ ۔۔۔" ویراں ہنسی کے مارے دُوہری ہوئی جارہی تھی۔
"اچھا انہیں دکھا تو سہی ۔۔۔ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہے۔؟"
ننھیال گئے ہوئے ہیں ۔۔۔ شاید رات لوٹ آئیں ۔۔۔ ان کا باپ انہیں اپنے ساتھ لانے کے لیے گیا ہوا ہے۔!"
ویراں اُٹھنے لگی تو جگدیپ نے اس کا بازو پکڑ لیا "کیا باتیں کر کے پیٹ بھر گیا؟"
"ذرا چرخے کی خبر تو لوں ۔۔۔ کیا تو باتوں سے روٹی کھائے گا؟"
"روٹی تو روز کھانے کو مل جاتی ہے ۔۔۔ یہ تیری باتیں نہیں مل سکیں گی۔"
جگدیپ ہنسنے لگا ۔۔۔ ویراں کو خوش دیکھ کر وہ بھی آج بہت خوش تھا وہ کچھ اس طرح خوش تھا جیسے کوئی اپنی بیٹی اور بہن کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔
"وہاں میرے پاس آ کر بیٹھ جا ۔۔۔ مونڈھا بچھائے دیتی ہوں ۔۔۔" ویراں نے چوکے میں مونڈھا ڈال دیا اور جگدیپ کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ خود دہلیز میں بیٹھ کر دال

کی چھٹائی کرنے لگی۔

ویراں نے دال چولھے پر رکھ دی ــــ آلو بھونے ــــ میٹھی سویّاں بنائیں اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی۔

"کیا تو مجھے اپنی شادی پر بلائے گا ــــ شہر کی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں۔؟ ان کو کہیں زیادہ غرور تو نہیں ہوتا ــــ؟ تیری چچی کہہ رہی تھی کہ تجھے ولایت جانا ہے ــــ وہاں سے کوئی میم نہ لے آنا۔"

جگدیپ ہنستا رہا ــــ کبھی اس کی کسی بات کا جواب دیدیتا اور کبھی خاموش رہتا ــــ توے پر سے پراٹھے اتار کر ویراں نے جگدیپ کے لیے کھانا پروس دیا۔

"پہلے سب کا انتظار کرلیں ــــ پھر اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔"

"نہ جانے وہ کب آئیں ــــ اور پھر میری ماں انہیں کھانا کھلا کر ہی بھیجے گی انہیں یونہی نہیں آنے دے گی۔"

"اچھا تو پکالے ــــ میں اور تو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔"

"ارے ــــ گرم گرم روٹی کھالے۔

"اونہہ ہوں۔"

ویراں نے شکست مان لی ــــ جب اس نے چار پانچ پراٹھے پکا لیے تو وہ بولی ــــ "امّاں اور بیٹیا مل کر روٹی کھائیں۔"

جگدیپ نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا ــــ "پہلے مجھے یہ بتا کہ تو میری ماں ہے، بہن ہے کہ بیٹی ہے ــ؟"

"میں تیری سب کچھ ہوں ــــ" ویراں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ــــ

رات کا ہلکا سا دھندلکا پھیل چکا تھا جب ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا۔ دیراں کے دونوں بچے اور ان بچوں کا باپ آپہنچے تھے۔

"ذرا بتاؤ تو سہی ـــــ ہمارے گھر کون آیا ہے؟"

"میں بتاؤں ـــ؟" بھگت رام کی آواز آئی۔

"تم بتا ہی نہیں سکتے۔"

"اگر بتا دوں تو ـــ"

"ایک ایک روپے کی شرط۔"

"لاؤ روپیہ نکالو۔"

"میں کیوں نکالوں ـــ تم نکالو۔"

"تمھیں دینا ہوگا۔ اور دودھ میں دھو کر دینا ہوگا۔"

"اچھا دو دو روپے کی شرط رہی ـــ"

"جگدیپ آیا ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا ـ؟" دیراں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اگر جگدیپ نہ ہوتا تو شرط ہی کیوں لگاتی ـــ" بھگت رام نے ہنستے ہوئے کہا جگدیپ چارپائی پر سے اُٹھ بیٹھا ـــ بھگت رام اس سے یوں بغل گیر ہُوا جیسے مدت کے بچھڑے ہوئے دوست ملتے ہیں۔

دونوں بچے جگدیپ کی طرف چپ کھڑے دیکھ رہے تھے ـــ باری باری جگدیپ نے ان کو اپنی گود میں اُٹھا لیا۔

"ان سے تو میری اب دوستی ہو جائے گی ـــ" جگدیپ نے کہا اور کشمیر سے

لایا ہوا پھلوں کا بکس کھولنے لگا۔

بھگت رام سے جب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی جگدیپ کے دل میں ذرا سی جھجک تھی لیکن بھگت رام کی ہر ایک بات سے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کا پرانا دوست ہو ــــ بھگت رام نے اپنے ہاتھوں سے خریدی ہوئی زمین اور فصلوں کی بات اس انداز سے چھیڑی جگدیپ کو بار بار یہ خیال آتا انسان کا دل سیر ہو تو وہ کیا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا۔

شرخ آلو بخارے کھاتے ہوئے بچے جگدیپ کے ساتھ یوں باتیں کر رہے تھے جیسے اس کے ساتھ ان کی پرانی جان پہچان ہو۔

دوسرے دن صبح کو جگدیپ کو وہاں سے روانہ ہونا تھا لیکن جب ویراں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے کہا ــــ آج کا دن اور رک جاؤ ــــ پھر جیتے جی نہ جانے کب ملاقات ہو ــــ تو جگدیپ انکار نہ کر سکا۔

دوسرے دن جگدیپ روانہ ہوا تو اس نے ویراں کو اپنی آغوش میں لیکر پیار کیا ــــ وہ کچھ اس طرح خوش تھا جیسے کوئی اپنی بہن اور بیٹی کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

جگدیپ نے دلی آکر سب سے پہلی جو تصویر بنائی وہ سرو کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوئی ریکھا کی تھی ـــــ وہ سوئی دھاگا لیکر پیڑ کے سبز دانوں کی مالا پرو رہی تھی ـــــ تصویر میں اس نے ریکھا کا چہرہ زیادہ تر پتوں کی اوٹ میں دکھایا تھا ـــــ وہ جانتا تھا کہ لوگ جب چہروں کو پہچان لیتے ہیں تو اُن کی آنکھوں میں کانٹے اُگ آتے ہیں اور جب وہ دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں تو جیسے کانٹے چبھوتے ہیں وہ ریکھا کے چہرے پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا ۔

زرد پھولوں کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوئے دو بت بنائے جن کے قدموں تلے پھولوں کا فرش تھا اور جن کے سر پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی ۔

ایک تصویر میں جگدیپ نے بادلوں کی طرح اندھیروں کے جھرمٹ بنائے اور روشنی کی ایک مہین اور باریک لکیر بنائی جو اندھیروں کی گھنی تہوں کو چیر رہی تھی ۔ اس کے نیچے جگدیپ نے نہایت پتلی سطر لکھی :

"لاکھ اندھیرے پار کرتی چیرتی ، آ رہی ہے روشنی کی ایک لکیر"

جگدیپ تصویریں بناتا جا رہا تھا اور اس کا سوال عظیم ہوتا جا رہا تھا ـــــ

اسے محسوس ہوتا کہ روشنی کی لکیر نے ظلم ڈھایا تھا ــــ اس نے اس پہ یہ بات عیاں
کی تھی کہ اس کے اندھیرے کتنے گہرے اور بیکراں تھے ــــ روشنی کی یہ لکیر کچھ ایسی
تھی جیسے ہر لمحہ کسی کی کمی یا کوتاہی کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہی ہو۔

نمائش گیلری کے منتظمین نے اسے خط لکھا کہ وہ اس کی تصویروں کی نمائش
منعقد کر رہے ہیں ــــ ساتھ ہی ساتھ اسے خبروں کی فلم بنانے والوں نے لکھا کہ
وہ اگلے ہفتہ اس کے سٹوڈیو میں آکر فلم تیار کریں گے ــــ اپنی سب سے پسندیدہ تصویر
کو آگے رکھ کر اگر وہ مصور کی فلم بھی لے رکھیں تو یہ ایک نہایت اچھی بات ہوگی۔

جگدیپ کو جب بھی اپنی پسندیدہ تصویر کا انتخاب کرنا ہوتا وہ بہت سی تصویریں
اپنے سامنے رکھ لیتا اور اس کی نگاہ ایک ہی جگہ جا کر ٹھہر جاتی ــــ ستاروں کی پوشاک
پہن کر ایک خواب کی طرح کھڑی ہوئی نوراں۔

جگدیپ کی زندگی میں یہ تیسرا موقع تھا جب اس نے سوچا کہ وہ اس تصویر کو
دوبارہ بنائے۔

ہر آنے والے برس پر اسے یوں معلوم ہوتا جیسے وہ گذشتہ برس جتنا اچھا فنکار
نہیں تھا ــــ اپنی پہلی تخلیقات کے متعلق اس کا اطمینان   اطمینان نہ رہتا ــــ
فن اسے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے اپنے پاس بلاتا ــــ وہ آگے بڑھتا مگر فن اس سے
بھی آگے بڑھ جاتی۔

اب کے جب جگدیپ نے نئی تصویر بنائی تو نوراں کے بھولے اور معصوم خدو
خال میں دیکھا کہ چہرے کی متانت بھی سرائت کر گئی ــــ ایک دیوی جیسے اس
پر اپنا سایہ ڈال رہی ہو۔ نوراں اور دیکھا مل کر ایک ہو گئی تھیں ــــ جگدیپ ان میں

امتیاز نہیں کر سکتا تھا۔

فلم نمائش کی گئی ــــ جگدیپ کے سٹوڈیو کی دیواروں سے لٹکی ہوئی ــــ تصویروں اور کینوس پر کام کرتے ہوئے فن کار کی فلم ــــ کام کرتے ہوئے مصور کی انہوں نے تصویر کھینچی تو اس میں کینوس پر مصور کے ہاتھ کو سامنے رکھا مصور کو نہیں ــــ اس تصویر میں جگدیپ کی پیٹھ نظر آرہی تھی ــــ عقب میں اونچی جگہ کیمرہ رکھ کر یہ تصویر اتاری گئی تھی۔

بیچارے لوگ ــــ دل کی دیوار پر اپنا نام نہیں کندہ کر سکتے ــــ زمانہ کی دیوار پر اپنا نام ثبت نہیں کر سکتے ــــ جھوٹی تسلیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں ــــ " ریکھا کے یہ الفاظ جگدیپ کو یاد آ گئے ــــ آج کی فلم میں اسے ایک بات اچھی لگی ــــ فلم میں اس کا چہرہ سامنے نہیں تھا۔ اس کا فن سامنے تھا۔ نوراں اور ریکھا کا چہرہ ــــ جیسے زمانہ کی دیوار پر ان کا نام کندہ ہو گیا ہو۔

جگدیپ اپنے کاموں کو جوں جوں پھیلاتا جا رہا تھا اس کے دل کی ویرانی گھنی ہوتی جا رہی تھی ــــ بعض اوقات ریکھا کے یہ الفاظ اس کے جگر کے پار ہو جاتے ہیں کبھی کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب آپ کی تخلیق آپ کا مذاق اڑاتی ہے"۔

لوگ جگدیپ سے کہا کرتے تھے کہ تیری قسمت کی ریکھا بہت روشن ہے ورنہ جینے جی فن کاروں کو کون پوچھتا ہے ــــ " جگدیپ کے دل میں ایک جملہ ہلچل پیدا کر دیتا ــــ اس کی ہتھیلی پر کوئی ریکھا کیوں نہیں تھی ــــ ریکھا کی ریکھا ــــ اور اسے اپنی ہتھیلی بالکل خالی نظر آتی۔

دوسرے دن صبح کو نو بجے نمائش کی افتتاحی تقریب تھی ــــ اس رات جگدیپ

کا سٹوڈیو تصویروں سے خالی تھا ——— سب ہی تصویریں نمائش کی گیلری میں لیجائی گئی تھیں تاکہ لوگ ان کے دام لگائیں۔

خالی سٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے جگدیپ کو یوں معلوم ہوا جیسے اس کے اردگرد ایک سنسان ویرانی تھی ——— بھیانک ویرانی ——— اور پھر اس ویرانی میں سوچ کی ایک لہر اٹھی ——— دوسری پھر تیسری ——— چاروں طرف جل تھل ہو گیا۔

جگدیپ کے پاؤں اکھڑ گئے ——— کوئی لہر اسے دھکیل کر اُدھر لے جاتی اور کوئی ادھر ——— اس کا دل ان لہروں کے رحم وکرم پر تھا۔

اندھیرا بڑھتا گیا ——— لہریں اور بھی بلند اور بھی سیاہ اور بھی ڈراؤنی ہوتی گئیں۔

جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آخری گھڑی آ پہنچی ہو ——— اس نے اپنا سب کچھ ان لہروں کے حوالے کر دیا ——— اس کا سارا جسم لہروں کے تھپیڑوں سے ہانپنے لگا۔

پھر ایک جل پری نے ان لہروں کو ریزہ ریزہ کر دیا ——— اس کے پیروں میں پڑے ہوئے گھنگرو بج اٹھے ——— اس کے سارے جسم پر پانی کے قطروں کی پوشاک تھی جس میں سے اس کے سیپیوں کی طرح سفید اور چمکدار جسم کی آنچ آ رہی تھی۔

اس نے جگدیپ کو اپنی باہنوں میں لے لیا ——— لہروں کے تھپیڑے نرم پڑ گئے ——— پھولوں کی پتیوں کی طرح نرم اور ملائم اور وہ جل پری کی باہنوں میں پتیوں پر پڑی ہوئی شبنم کی طرح تھا۔

جل پری نے اپنے ہونٹوں کو جھکایا ——— مزید جھکایا ——— جگدیپ کو یوں لگا کہ اس کے ہونٹوں کو نرم اور ٹھنڈے ہونٹ چھو رہے تھے۔

"کیا تم خوش نہیں ہو ———" جل پری کی آواز آئی۔

"تم کون ہو۔"

"میں تمہیں پیار کرتی ہوں۔"

"مجھے ــــ" "ہاں ــــ"

"تم نوراں تو نہیں ہو ــــ؟"

"نہیں ــــ میں نوراں نہیں ہوں ــــ"

"تم دیکھا بھی نہیں ــــ"

"نہیں میں دیکھا بھی نہیں ــــ"

"پھر کون ہو ــــ؟"

"میں تمہیں پیار کرتی ہوں ــــ"

"میں نے تمہیں کبھی دیکھا ہی نہیں ــــ"

"مجھے اسی بات کا تو دکھ ہے تم میری طرف دیکھتے ہی نہیں ــــ"

"تم کہاں رہتی ہو ــــ"

"تیرے چاروں طرف ــــ"

"جھوٹ ــــ"

"تم مجھے ایک حقیقت کیوں نہیں مانتے ــــ"

"میں صبح کو تمہارے ساتھ ہوں گی ــــ"

"صبح کو ــــ"

"صبح کے نو بجے ــــ"

"کل صبح تو میری تصویروں کی نمائش دکھائی جا رہی ہے ــــ"

"ہمارے دیش کا سب سے بڑا آدمی اس نمائش کا لا گھاٹن کریگا ـــــ میں خوشبو کی طرح تمہارے ارد گرد پھیل جاؤں گی "

"خوشبو ـــــ"

"تم ایک پھول ہو ـــــ اور میں تمہاری مہک ہوں "

"تمہارا نام کیا ہے ـــ؟"

"شہرت "

"شہرت ـــ؟"

"میں تمہیں دنیا کا وردان کر ملی ہوں "

"وردان ـــــ"

"تم مجھے دیکھتے ہی نہیں ـــ کتنے ہی فن کار ریاضت کرتے ہوئے مر جاتے ہیں۔

"میں ان سے کبھی نہیں ملتی ـــ"

"لیکن میں نے تو کوئی وردان نہیں مانگا تھا ـــ"

"جو لوگ میرے پیچھے دوڑتے ہیں میں ان کو کبھی نہیں ملتی ـــ میں تمہیں اسی لیے ملی ہوں کہ تم نے مجھے مانگا نہیں تھا ـــ"

"اور میں نے جو کچھ مانگا تھا ـ؟"

"تم نے کیا مانگا تھا ـــ؟"

"تم نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں ایک پھول ہوں "

"ہاں ـــ؟"

"میں نے مانگا تھا کہ کوئی مجھے توڑ لے ـــ مجھے اپنے بالوں میں گوندے اور

میں اس کے بالوں سے چمٹا ہوا ختم ہو جاؤں۔"

"جانتے ہو پھر کیا ہوتا ــــ؟"

"کیا ہوتا ــــ؟"

"اس کی مہک صرف ایک ــــ صرف ایک انسان کو آتی ــــ!"

"ہاں ــــ"

"لیکن اب تمہاری مہک سارے باغ میں ساری دنیا میں پھیلے گی۔"

"مگر مجھے کیا ملے گا۔؟"

"نیک نامی۔"

"یہ دردان واپس لے جاؤ ــــ"

"نہیں ــــ"

"یہ دردان ایک پتھر ہے جو میری زندگی سے اٹھایا نہیں جاتا۔"

"زندگی زیادہ دن تو نہیں رہتی ــــ چالیس ــــ زیادہ سے زیادہ پچاس سال ــــ ساٹھ برس ــــ لیکن میں ابد تک تمہارے ساتھ وابستہ ہوں گی۔"

"جب میں نہیں ہوں گا تو پھر میں اپنے نام کو کیا کروں گا ــــ میں تمام عمر تمہارا بوجھ اٹھاتا مر جاؤں گا۔"

"تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا ــــ میں تم پر مہربان ہوں ــــ تمہارا دردان ہوں ــــ"

"دردان نہیں شراپ ــــ"

اور جگدیپ نے جل پری کی باہوں کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی

کوشش کی۔

جب وہ اپنے بازوؤں کا پورا زور لگا رہا تھا اس کی آنکھ کھل گئی۔ صبح کی روشنی کھڑکی سے گزر کر اس کے کمرے میں پھیل چکی تھی ـــــ جگدیپ نے ایک نگاہ اپنے کمرے میں دوڑائی ـــــ کمرہ تصویروں سے خالی تھا ـــــ اس کے دل سے ایک ٹیس اٹھی ـــــ "آج اس کی تخلیقات بھی اسے تنہا چھوڑ کر لوگوں کے پاس اپنی قیمت لگوانے چلی گئی تھیں۔

پریم نے جگدیپ کو آ... دیکھا تو وہ حیران رہ گیا۔

"آٹھ بج چلے ہیں جگدیپ —"

"اچھا —!

"تمہارا نوکر دوبارہ تمہاری چائے لایا تھا — پڑی پڑی ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور تم پیتے ہی نہیں —"

"پی لوں گا"۔

"نو بجے سے دس منٹ پہلے ہی ہمیں وہاں پہنچنا ہے"

"اچھا —"

"لوگ تم پر رشک کر رہے ہیں"

"کیوں —؟"

"کیا یہ پوچھنے کی بات ہے —؟ تمہاری جو عمر ہے اس میں کیا کسی فن کار کو اتنی شہرت نصیب ہوئی ہے — شہرت جیسی — شہر کے تمام مصور تمہارا نام سن کر جل بھن رہے ہیں"۔

پریم نے زبردستی جگدیپ کا بازو پکڑ لیا اور تولیا اس کے ہاتھ میں تھما کر اسے غسل خانے کی طرف بھیج دیا۔

نو بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے جب جگدیپ کو ساتھ لیکر پریم نمائش کی گیلری میں پہنچا — فوٹو گرافروں کے کیمروں میں بلب بار بار جل اٹھتا تھا اور بجھ جاتا تھا — جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک ایک کر کے تارے اس کے

آسمان پر نکل رہے تھے اور ٹوٹتے جا رہے تھے۔

ملک کے ہر دل عزیز وزیر کو دیکھنے کے لیے جگدیپ کے دل میں مدت سے ایک خواہش انگڑائی لے رہی تھی ــــ آج وہ ہر دلعزیز وزیر اس کی تصویروں کی نمائش کا اُدگھاٹن کرنے کے لیے آیا تھا ــــ اس نے جگدیپ کے گرد اپنا بازو ڈال کر اسے اپنے پہلو سے چمٹا لیا اور پھر نمائش کی گیلری کے دروازے پر لگے ہوئے ربن کو کاٹ دیا ــــ

جگدیپ کو ایک بار تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا آسمان بے پناہ روشنی سے جگمگا اٹھا ہو۔ دوسرے لمحہ ہی وہ سورج ڈھل گیا اور آسمان پہلے سے بھی زیادہ تاریک ہو گیا، گیلری میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی ــــ کسی کی آنکھیں ایک تصویر پر جمی ہوئی تھیں تو دوسرے کی کسی اور تصویر پر۔

"جگدیپ ــــ" ایک دبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ریکھا ــــ" جگدیپ نے دیکھا ریکھا اس کے کندھے کے پاس کھڑی ہوئی اسے آواز دے رہی تھی۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ریکھا ــــ" جگدیپ سے دیکھا نہ گیا۔

ریکھا کا چہرہ نہ جانے کون سے مرض سے نچڑ گیا تھا ــــ سیاہ رنگ کا شال اس نے لپیٹ رکھا تھا اور لڑکی نے اسے بازوؤں کا سہارا دے رکھا تھا۔

"انہیں ایک برس سے بخار آ رہا ہے۔ آج بھی ان میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی لیکن آنے پر بضد تھیں ــــ" ریکھا کی سہیلی نے کہا۔

جگدیپ سے کچھ کہا نہ گیا۔

میں آج بہت خوش ہوں جگدیپ ــــ میں آج کا دن دیکھنے کی بہت مشتاق تھی۔ میرے ساتھ چل کر مجھے اپنی تمام تصویریں دکھاؤ۔

جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے آنسوؤں نے اس کی آنکھیں بند کر دی تھیں اور اس کے ہونٹوں میں جنبش کی سکت نہیں تھی۔

"یہ زرد پھولوں والا درخت ـــــ یہ تصویر کب بنائی تھی ـــ؟" ریکھا آہستہ آہستہ چلتی رہی اور تصویریں دیکھتی رہی۔

یہ ہاؤس بوٹ ـــ یہ بارہ دری کی کھڑکی ـــ یہ تصویر بہت پیاری ہے جگدیپ ـــ تاریکیوں کی تصویر ـــ تاریکی کی کیسے تہہ پر تہہ چڑھی ہوئی ہے ـــ" تصویر کے نیچے ریکھا نے پڑھا۔

لاکھ اندھیرے پار کرتی چیرتی
آ رہی ہے روشنی کی اک لکیر

یہ اس کا اپنا شعر تھا۔

اپنے شال کے پلّو سے ریکھا نے ایک بار اپنی آنکھیں پونچھیں۔

سامنے "سپنا" عنوان کی تصویر ٹنگی ہوئی تھی ـــ ستاروں والی پوشاک پہن کر کھڑی ہوئی ایک دوشیزہ۔

"کیا یہ وہ تصویر تو نہیں جو اچھابل میں تمہارے کمرے کے اندر ٹنگی ہوئی تھی"۔؟

"نہیں ـــ دوبارہ بنائی ہے"۔

نہ ریکھا قدم اٹھا سکی نہ جگدیپ ـــ اور پھر جگدیپ نے آہستہ سے کہا ـــ!

"کیا آپ کو اس میں کوئی فرق نظر آتا ہے۔؟"

"ہاں ـــ"

"بھلا کیا ـــ؟"

"آپ نے جیسے ایک چہرے میں دوسرا چہرہ سمو دیا ہے"

ایک بار تو جگدیپ کو یوں لگا جیسے اُس کا تیر نشانے پر بیٹھا ہو ــــ ریکھا نے نوراں کے چہرے میں جذب اپنا چہرہ پہچان لیا تھا ــــ دوسرے ہی لمحہ جگدیپ کے دل میں ایک سوال نے سر اُبھارا ــــ " کیسا نشانہ ــــ کیسی جگہ ــــ اس ضرب کے لیے ریکھا کے پاس کونسی جگہ ــــ اور زندگی کے پاس کونسی جگہ ہے ــ؟"

اگلی تصویر سرو کے پیڑ کے پاس کھڑی سبز دانوں کی مالا پروتی ہوئی ایک دوشیزہ کی تھی۔

"سرو کے دانے ــــ" ریکھا نے کہا۔

مالا تو میں نے خود پرودی تھی ــــ آپ نے نہیں ــــ جگدیپ نے غمزدہ ہو کر کہا۔

ریکھا نے بڑی دیر تک کوئی جواب نہ دیا ــــ اور پھر آہستہ سے کہا ــــ تیرے پاس مالا پرونے کے لیے ہاتھ ہی کہاں تھے۔"

ریکھا سے کھڑا نہ رہا گیا ــــ اس نے دیوار کا سہارا لیا ــــ ریکھا کی سہیلی نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا ــــ "آؤ واپس چلیں ــــ تکلیف بڑھ جائے گی"۔

"کہاں جانا ہے ــــ؟"

"میں یہیں دلّی میں ہوں"۔

"کب سے ــ؟"

"چار مہینے ہو چکے ہیں"۔

"چار مہینے ــــ؟"

"وہ کہتے تھے یہاں اچھے ڈاکٹر ہیں"۔

"مجھے اپنا پتہ کیوں نہ دیا ــــ؟"

ریکھا نے کافی دیر تک چپ رہنے کے بعد کہا ــــ "میں سوچتی تھی کہ آپ مجھے بیماری کی حالت میں نہ دیکھیں تو اچھا ہے"۔

"پاگل —" جگدیپ کے منہ سے نکل گیا۔

سہیلی نے ریکھا کا بازو پکڑ لیا اور اسے وہاں سے چلنے کے لیے پھر زور دیا۔

"کیا میں آپ کے ساتھ چلوں —؟" جگدیپ نے پوچھا۔

"نہیں — آپ کو یہیں رہنا چاہیئے — یہ تمام لوگ آپ ہی کے لیے تو یہاں آئے ہوئے ہیں"

"مجھے یہاں کیا کرنا ہے — تصویریں لگی ہوئی ہیں — لوگ دیکھتے رہیں گے"

جگدیپ نے ریکھا کی طرف اس طرح دیکھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے دنیا میں ایک لمحہ کے لیے زندگی بسر کر لی ہو —!

ریکھا کی سہیلی نے اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دیے رکھا اور ریکھا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی باہر کے دروازے کے پاس آ گئی — جگدیپ اس کے ساتھ تھا۔

"میں نے آپ کی ایک تصویر تو پہلے بھی دیکھی تھی لیکن آج ساری کی ساری دیکھ لی ہیں —" ریکھا کی سہیلی نے جگدیپ سے کہا۔

"ایک تصویر پہلے دیکھی تھی — کب —؟"

"میرے ساتھ چلو گے —؟" ریکھا نے آہستہ سے کہا۔

ریکھا کی سہیلی نے ریکھا کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور جگدیپ سے کہا — "ریکھا بھی تو ایک تصویر ہے — اور تمہاری ہے —"

جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے دنیا کی سب سے بہتر تصویر پر کسی نے اس کا نام لکھ دیا ہو۔

اس نے ریکھا کو آہستہ سے اپنے پہلو کے ساتھ لگا لیا۔

اس روز جگدیپ جب ریکھا کو چھوڑ کر اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو راستہ میں بارش آ گئی ـــ مینہ کی بوچھاڑ کچھ اتنی تیز تھی چار قدم چلنا بھی محال ہو گیا۔ سڑک سے گزرتے ہوئے لوگوں نے پاس کی دکانوں کے برآمدوں میں جا کر پناہ لی ـــ لیکن جس جگہ جگدیپ موجود تھا۔ وہاں آس پاس کوئی برآمدہ نہیں تھا ـــ ایک پیڑ تھا ـــ جگدیپ اس کے نیچے جا کھڑا ہوا ـــ بارش تھی کہ ایک بہت بڑا طوفان تھا ـــ درخت کے نیچے کھڑا ہوا جگدیپ بارش سے شرابور ہو گیا ـــ سردیوں کے دن تھے ـــ اس کا بدن کانپنے لگا ـــ نزدیک کوئی جائے پناہ نہیں تھی ـــ سڑک پر سے کچھ کاریں گزر رہی تھیں ـــ جہاں جگدیپ کھڑا تھا وہاں سے بائیں طرف سڑک کا چوک تھا ـــ سامنے کچھ کاریں رک گئیں ـــ کانسٹیبل کا ہاتھ دوسری طرف تھا اور جن لوگوں کی کاریں رک گئی تھیں وہ اپنی طرف ہاتھ کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ سامنے سرخ رنگ کی ایک کار میں جگدیپ نے دیکھا رمندر بیٹھی ہوئی تھی ـــ اگلی نشست پر ـــ کار وہ خود چلا رہی تھی ـــ ڈرائیور پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا ـــ اسے دیکھے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے مگر جگدیپ نے اسے پہچان لیا ـــ اور پھر رمندر کی نگاہ بائیں طرف پڑی۔ پیڑ تلے ـــ جہاں جگدیپ کھڑا تھا ـــ رمندر نے چونک کر دیکھا ـــ جگدیپ کو

اب اس بات میں شک نہ رہا — رمندر نے بھی اسے پہچان لیا تھا — ایک جھٹکے کے ساتھ رمندر نے اپنا منہ پھیر لیا — کانسٹیبل نے ہاتھ سے اشارہ دیا اور رمندر نے تیزی کے ساتھ اپنی کار اس کے آگے سے گذار لی۔

مینہ میں شرابور اور سردی سے کانپتے ہوئے جگدیپ کو ہنسی آگئی — اسے یاد آیا کہ رمندر کے ماڈل سے اُس نے جو پہلی تصویر بنائی تھی اس کا نام اُس نے "دنیا" رکھا تھا — اس وقت اسے معلوم نہیں تھا دنیا کا برتاؤ کیسا ہوتا ہے — دنیا اسے خرید لینا چاہتی تھی — اسے اپنا غلام بنا لینا چاہتی تھی — اس کے "خواب" کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھی — پھر جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا تاش کے پتوں کا ایک کھیل ہو — رمندر — رمندر — تاش کے پتوں کا ایک کھیل اس کے پتے ہی چھوٹے تھے — وہ کیا کر سکتا تھا — کوئی بھی ذہانت اس کے چھوٹے پتوں کو بڑا نہیں کر سکتی تھی۔

پھر ایک خالی ٹیکسی گذری — جگدیپ نے ہاتھ کا اشارہ کیا — ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر آگیا۔

اس رات پریم نے اس سے آکر کہا۔

"صبح تم نے یہ کیا کیا —؟"

"کیوں — کیا ہوا —؟"

"تم نمائش کی گیلری سے چلے کیوں آئے —؟"

"اس میں ایسی کون سی بات ہے"

"لوگ باتیں بنا رہے تھے"

"لوگوں کا اس بات سے کیا واسطہ ہے؟"

"تم نہیں سمجھتے جگدیپ ــــ لوگ تو کوئی بات چاہتے ہیں۔"

"وہاں لوگ کہاں تھے ــــ فن کار تھے یا فن کے پرکھنے والے ــــ میں چلا آیا ــــ انہیں مجھ سے کیا لینا تھا ــــ میرا فن تو وہیں تھا۔"

"اس دنیا میں فن کار ہوتے ہی کتنے ہیں ــــ؟ فن کے پرکھنے والے کتنے ہوتے ہیں ــــ؟ بار بار ریکھا کا نام لے رہے تھے۔"

"ریکھا کا۔"

"وہ بھی تو تمہارے جتنی شہرت کی مالک ہے ــــ ویسے کسی نے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو ــــ مگر تصویروں سے تو پہچان جاتے ہیں ــــ؟ کئی بار اخباروں میں اس کی تصویریں چھپ چکی ہیں۔"

"تو پھر کون سا گناہ ہو گیا ــــ ریکھا بیمار ہے ــــ آنٹی بیمار ہے کہ ــــ"

"لوگ کسی کے دکھ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے جگدیپ۔"

"آج مجھ سے کچھ نہ کہو پریم۔"

جگدیپ گھنٹہ بھر پسینہ میں بھیگتا رہا تھا ــــ اسے ہلکا ہلکا بخار ہو گیا۔

پریم نے اسے برانڈی دی اور کمرے میں کوئلوں کی انگیٹھی جلا دی۔

پریم گزشتہ تین برس سے جگدیپ کے گھر ہی میں رہ رہا تھا ــــ تین برس ہو گئے تھے جب جگدیپ اپنے فلیٹ کے دو کمرے بند کر کے اور تیسرا کمرہ پریم کو دے کر دکن کی طرف چلا گیا تھا ــــ پریم تب سے وہیں رہ رہا تھا ــــ جگدیپ جب واپس آیا تھا تو اس وقت دلی میں مکان ملنے دشوار ہو گئے تھے ــــ ویسے بھی جگدیپ کو پریم اچھا لگتا

تھا ــــ وہ کوئی فن کار نہیں تھا ــــ ایک سرکاری دفتر میں کام کرتا تھا مگر اس کے پہلو میں فن کاروں کا دل تھا ــــ رات کو جب کبھی جگدیپ فارغ ہوتا تو وہ اسے کتابوں کے حسین اور نفیس جملے سنایا کرتا ــــ جگدیپ کو وہ بہت اچھا لگتا تھا۔

اس رات پریم اپنے کمرے میں نہ گیا ــــ جگدیپ کے پلنگ کے پاس پڑے ہوئے صوفے پر سو گیا ــــ آدھی رات گئے پریم نے اٹھ کر دیکھا جگدیپ تیز بخار میں بھن رہا تھا۔

دوسری صبح کو جگدیپ نے پریم سے کہا کہ وہ اس کے لیے ایک ٹیکسی منگوا دے۔

"مرنے کی اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیئے ــــ" پریم نے برہم ہو کر کہا۔

اور پھر جگدیپ کو چائے کی پیالی دیکر کہنے لگا ــــ میں آدھ گھنٹے میں آجاؤں گا ــــ دفتر چھٹی کی درخواست دے آؤں گا ــــ اور آتے ہوئے ڈاکٹر کو بلا لاؤں گا ــــ اگر تم نے یہاں سے ہلنے کی کوشش کی تو . . . . ."

"لیکن پریم ــــ"

"اچھا ــــ تم مجھے اس کے گھر کا پتہ بتا دو ــــ میں ریکھا کو مطلع کر دوں گا"

"نہیں ــــ نہیں ــــ وہ تو بیچاری خود بیمار ہے"

شام تک تمہارا بخار اتر جائے گا چچا جان ــــ کل صبح چلے جانا ــــ پریم نے کمبل جگدیپ کے گرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا ــــ اگر تم نے ضد کی تو میں باہر تالا لگا کر جاؤں گا"

پریم چلا گیا ــــ آدھ گھنٹہ یا چالیس منٹ گذرے ہونگے۔ جب پریم نے الٹے پاؤں کمرے میں آکر اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ ــــ "ڈاکٹر صاحب آئے ہیں"

"ڈاکٹر — ؟"

"کیا اندر لے آؤں ؟"

"لے آؤ —"

پریم نے مونڈھا پلنگ کے پاس سرکا دیا اور جب وہ کمرے سے باہر جانے لگا۔ تو جگدیپ نے اسے آواز دی۔

"کیا بات — ؟"

"اُدھر گئے تھے — !"

"کدھر — ؟"

"مجھے کیوں تنگ کر رہے ہو ؟"

"ابھی وقت نہیں ملا — تھوڑی دیر تک جاؤں گا —" پریم ہنس دیا۔

جگدیپ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دیکھا کمرے کی دہلیز تک پہنچ گئی۔

"ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں ؟"

"تم ہو ریکھا ۔؟"

"یہ بخار کہاں سے آ گئے ۔؟"

"کچھ نہیں ریکھا ۔۔۔ مگر تم کیوں آئیں ۔؟"

"آج میری طبیعت ذرا اچھی تھی ۔۔۔ بہت ہی اچھی۔"

"اگر پھر خراب ہو گئی تو ۔؟"

"نہیں ہوتی ۔۔۔ آج نہیں ہوتی ۔۔۔ ریکھا صوفے پر بیٹھ گئی ۔

پریم شاید چائے بنانے کے لیے چلا گیا تھا ۔

"تم شاید بارش میں بہت بھیگ گئے ۔؟ ریکھا نے آہستہ سے کہا ۔

جگدیپ کو کل کی بارش یاد آ گئی ۔۔۔ اور پھر بارش میں بھیگتے اور سردی سے کانپتے ہوئے اس کے پاس سے رمندر کا منہ پھیر کر اور کار گزار کر سے جانا یاد آیا ۔۔۔ اسے خیال آیا ۔۔۔ جب کوئی دنیا کا غلام نہیں بنتا دنیا اس سے منہ موڑ لیتی ہے ۔۔۔! دنیا لاکھ منہ پھیرے ۔۔۔ میں اپنے سپنے کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہونے دوں گا ۔۔۔"

جگدیپ اندر اندر بل کھانے لگا ۔

"ایسی بارش روز ہو ۔۔۔" جگدیپ ہنس پڑا ۔

"اور روز بخار ہو جائے —"

"ہاں — اور روز کوئی خبر گیری کے لیے آئے۔"

"تم پتلون پہن کر کیوں سوئے ہوئے ہو — کیا اس طرح تکلیف نہیں ہوتی"۔

"نہیں دیکھا — میں ہمیشہ اسی طرح سویا کرتا ہوں۔

"پتلون پہن کر —" دیکھا جیسے حیران رہ گئی۔

جگدیپ ہنس پڑا — "میری ایک ذہنی پیچیدگی ہے دیکھا — میں پاجامہ پہن ہی نہیں سکتا — بالخصوص دھاری دار پاجامہ"

"کیسی ذہنی پیچیدگی —؟"

"قصہ سنا دوں —"

"نہ سنانے والی ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے"

"بات کوئی بڑی نہیں — لیکن اپنے پیچھے گہرا نشان چھوڑ گئی ہے۔ میں جب نیا نیا شہر میں آیا تھا تو اپنے سکول میں پاجامہ پہن کر گیا تھا۔ دھاری دار پاجامہ — مجھے معلوم نہیں تھا کہ شہر میں لوگ دھاری دار پاجامہ سونے سے پہلے پہنتے ہیں"

"پھر کیا ہوا —" دیکھا ہنس پڑی۔

"مجھے یہ بات بتاتا کوئی نہیں تھا۔ لیکن سب ہی لڑکے میری طرف دیکھتے اور ہنستے ایک دن گزر گیا — دو دن گزر گئے — تین دن گزر گئے — لڑکے میری طرف یوں دیکھتے — میرا جی چاہتا میں اسکول سے بھاگ جاؤں —" جگدیپ ہنسنے لگا

میری ڈرائنگ اتنی اچھی تھی — میرے ماسٹر نے میری کاپی بورڈ سے لٹکا کر سب کو دکھائی۔ میری پیٹھ پر کچھ ایسی تھپکی دی کہ اس کے سامنے رو پڑا — اور اپنا دل

کھول کر رکھ دیا۔"

"اس نے بتایا ہوگا کہ۔۔۔"

"ہاں ریکھا ۔۔۔ میں نے اگلے دن سے پاجامہ پہننا ہی چھوڑ دیا ۔۔۔ اور پھر اس کے بعد باہر تو کیا گھر میں بھی نہیں پہن سکا ۔۔۔ سوتے ہوئے بھی نہیں ۔۔۔ دھاری دار تو خیر پہننا ہی نہیں تھا سفید پاجامہ بھی نہیں پہن سکا۔"

ریکھا اتنے بڑے مصور کی اتنی بڑی ذہنی پیچیدگی پر کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔۔۔ اور اسے جگدیپ کے دل کی سادگی اس کے تمام فنون سے عظیم معلوم ہوئی ۔۔۔ اتنے میں پریم نے آکر کہا "ڈاکٹر آگیا ہے ۔۔۔!"

"تم نے کتنے ڈاکٹر بلوائے ہیں ۔۔۔؟" جگدیپ ہنس پڑا۔

"اب میں ایک نقلی ڈاکٹر لایا ہوں ۔۔۔" پریم بھی ہنس پڑا۔

ڈاکٹر نے آکر پانچ سات منٹ تک اسے دیکھا ۔۔۔ تھرمامیٹر لگایا اور پھر ریکھا کی طرف منہ کر کے کہا ۔۔۔ "تین تین گھنٹوں کے بعد خوراک دیتے رہیے گا ۔۔۔ اگر سر میں درد زیادہ ہو تو تھوڑی سی وکس مل دیجیے گا۔"

"بہت اچھا ۔۔۔" ریکھا نے آہستہ سے کہا اور سر جھکا لیا۔

ڈاکٹر چلا گیا ۔۔۔ پریم بھی اس کے ساتھ دوا لانے چلا گیا ۔۔۔ جگدیپ نے دیکھا ریکھا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ۔۔۔ دونوں نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکے ۔۔۔ جگدیپ نے ریکھا کا ہاتھ تھام لیا ۔۔۔ ریکھا نے اپنا سر مونڈھے سے لگا دیا ۔۔۔ آنسوؤں کے کتنے ہی قطرے ریکھا کے چہرے کو بھگو گئے۔

پریم نے پندرہ بیس منٹ کے بعد آکر دوا اور وکس کی شیشی میز پر رکھ دی

اور ہنس کے ریکھا سے کہنے لگا ـــــ تین تین گھنٹوں بعد خوراک دیدیجیے گا ـــ اگر سر میں درد زیادہ ہو تو تھوڑی سی وکس مل دیجیے گا۔"

ریکھا ہنس پڑی ـ

"تم کہاں جا رہے ہو ـــ ؟" جگدیپ نے تنک کر پریم سے کہا ـ

"دفتر سے چھٹی نہیں ملی ـــ دفتر جا رہا ہوں ـ"

"چل ہٹ ـــ بیٹھ جا یہاں ـــ"

تینوں ہنس پڑے اور پریم ایک کرسی پر بیٹھ گیا ـ

ریکھا نے جگدیپ کو دوا کی خوراک دے کر کہا ـــــ "سر میں درد زیادہ تو نہیں ہو رہا ـ ؟"

جگدیپ ـــ "نہیں " کہنے ہی والا تھا مگر اس کی ہنسی چھوٹ گئی اور وہ بولا ـ

"سر میں سخت درد ہو رہا ہے ـ"

ریکھا ہنس پڑی مگر اپنی نرم اور دبلی انگلیوں سے جگدیپ کی پیشانی پر وکس ملنے لگی ـ

پریم نے نوکر سے جا کر کہا کہ وہ چائے تیار کر کے لے آئے ـــ جب چائے آئی تو ریکھا سے چائے کی پیالی لے کر جگدیپ نے کہا ـــ "جن کی آنی خاطر و مدارات ہو وہ بھلا اچھا کیوں ہونے لگا ـ"

بیماری سے ریکھا کا رنگ کچھ سنولا گیا تھا ـــ ریکھا کی باہوں سے جگدیپ نے اپنی باہیں ماپ کر کہا ـــ "ان چاروں بازوؤں کا رنگ ایک سا ہے ریکھا ـــ بتاؤ تمہاری کونسی ہیں اور میری کونسی ـ ؟"

پہلے تو ریکھا کے جی میں یہ آیا کہ وہ کہہ دے "چاروں تمہاری ہیں" لیکن ریکھا کے چہرے پر اداسی کی ایک اور سانولی پرچھائیں پڑی اور اس نے اپنے دونوں بازوؤں کی طرف دیکھ کر کہا ــــ "اب یہ بازو میرے نہیں ہیں ــــ" اور پھر ایک سرد آہ بھر کر وہ جگدیپ کے بازوؤں کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ــــ "اور یہ بازو میرے بن نہیں سکتے۔"

جگدیپ ریکھا کی یہ افسردگی برداشت نہ کر سکا ــــ! اس نے اپنے بازو ریکھا کے بازوؤں پر لپیٹ دیئے۔

اور پھر جو بات ریکھا کہنے لگی تھی اس کے ہونٹوں پر آگئی ــــ "چاروں تمہارے ہیں۔"

ریکھا کو وہاں آئے ہوئے تین گھنٹے ہو گئے تھے اور ریکھا کی سہیلی اسے ساتھ لے چلنے کے لیے آگئی۔

"ڈاکٹر دو بجے آئے گا انجکشن لگانے ــــ اس کا فون آیا تھا اور اب ایک بج چکا ہے ــــ سہیلی نے ریکھا سے کہا اور پھر جگدیپ کا حال پوچھنے لگی۔

"تم نے ڈاکٹر کو شام کا وقت دیدیا ہوتا ــــ" ریکھا نے کہا۔

میں نے بہت کہا مگر ڈاکٹر مانا ہی نہیں ــــ اور پھر اس سے کہتی کیا کہ مریض گھر میں نہیں ہے ــــ" سہیلی نے آہستہ سے ریکھا کا ہاتھ دبایا۔

پریم ایک چھوٹی ٹیکسی لے آیا ــــ ریکھا جب جانے لگی تو جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی میں پہلی بار تین گھنٹوں کے لیے اس کا گھر آباد ہوا۔

ــــــــــ

ایک آدھ دن میں جگدیپ کا بخار اتر گیا ـــــ اب وہ ہر روز دن میں ایک بار ریکھا کو ملا کر دیکھ آتا تھا ـــــ ریکھا کے گھر میں صرف اس کا پتی تھا۔ نوکر تھے اور سہیلی تھی ـــــ سہیلی نے جیسے خود کو ریکھا کے لیے وقف کر دیا تھا ـــــ اس کا خاوند آج کل لندن میں تھا اور اس نے اپنے خاوند کو لکھ دیا تھا کہ جب تک ریکھا بیمار ہے وہ اپنے گھر میں نہیں رہے گی ـــــ ریکھا کے پاس رہے گی۔

زندگی میں جگدیپ کے پھر چلے آنے سے ریکھا کے چہرے پر رونق آ گئی تھی جیسے زندگی نے اسے چند روز کی بھیک دیدی ہو۔ مگر زندگی اتنی مہربان نہیں تھی جتنا کہ سب نے سوچ رکھا تھا۔ ایک دن اچانک ہی ریکھا کو متلی ہوئی ـــــ متلی میں خون تھا ـــــ ڈاکٹر بھی ناامید ہو گیا۔

جب سے جگدیپ اپنی ماں سے محروم ہوا تھا تب سے اسے خدا پر یقین نہیں رہا تھا۔ جگدیپ کو محسوس ہوا تھا ـــــ خدا کسی کا نہیں ـــــ خدا بچوں کی بھی نہیں سنتا ـــــ" اس کے بعد اس نے خدا سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

ـــــ آج جگدیپ کی زندگی میں دوسری بار امتحان کی گھڑی آئی تھی ـــــ اس کے دل کے درد نے خدا سے کہا ـــــ آج تجھے پھر آزماؤں گا۔ تو نے ایک بچے کے پاکیزہ دل کی لاج نہیں رکھی تھی ـــــ آج محبت کے پاکیزہ اور مقدس دل کی لاج رکھے گا۔

یا نہیں ۔؟ ریکھا کو زندگی دیدے ۔۔۔ میں دنیا میں کسی کا دل نہیں دکھاؤں گا ۔۔۔ میں کبھی ریکھا کے خاوند کا بھی دل نہیں دکھاؤں گا ۔"

ایک دن ریکھا میں پلنگ پر سے اٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی مگر اس نے جگدیپ سے کہا ۔۔۔ "میرا جی تمہارے سٹوڈیو میں جانے کو چاہتا ہے ۔"

"اس حالت میں ۔۔۔؟"

"نمائش ختم ہو گئی کیا ۔؟"

"کبھی کی ۔"

"کیا تصویریں واپس آگئی ہیں ۔؟"

"ہاں ۔۔۔"

"میرا انہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے ۔۔۔ سب ہی تصویریں دیکھنے کو جی چاہتا ہے ۔ زرد پھولوں والے پیڑ کی تصویر ۔۔۔ ہاؤس بوٹ والی ۔۔۔ سرو کے پیڑ والی ۔"

"میں سب تصویریں یہاں لے آؤں گا ۔"

"میرا جی چاہتا ہے کہ تم میرے سامنے بیٹھ کر ایک تصویر بناؤ ۔"

"میں یہیں بنا دوں گا ۔"

"نہیں ۔۔۔ ایسے نہیں ۔۔۔ یہاں تو میں چارپائی پر پڑی ہوں ۔ تمہارے سٹوڈیو میں بیٹھ کر ! ۔۔۔ کیا تمہیں یاد ہے ایک بار تم نے مجھے ایک بات سنائی تھی ۔"

"کون سی ۔؟"

"اپنے گاؤں کے مکان کی بالائی منزل میں بیٹھ کر تم نے نوراں کی تصویر بنائی تھی !"

"ہاں"

"اس نے ستاروں والی چنری اوڑھی ہوئی تھی - میں بھی ستاروں والا دوپٹہ اوڑھونگی۔
" ریکھا " جگدیپ کے آنسو اس کی آنکھوں میں لرزنے لگے۔

دوسرے دن کشمیر میں بنائی ہوئی تمام تصویریں اپنے یہاں سے لاکر جگدیپ نے ریکھا کے کمرے میں لگا دیں ریکھا نے ان کی طرف بار بار دیکھا اور پھر کہا "کیا تمہیں یاد ہے زرد رنگ کے پھولوں والے درخت کے نیچے بیٹھ کر تم نے کیا کہا تھا - ؟"

"یاد ہے ریکھا"

"تم نے کہا تھا پھول گریں اور اتنے گریں میں ان کے نیچے دب جاؤں پھولوں کی قبر بن جائے اور میں قبر میں سویا رہوں"

"آج زیادہ باتیں نہ کرو ریکھا تمہاری طبیعت اچھی نہیں"

"آج تم پھولوں سے کہو کہ وہ میری چارپائی پر گریں اور اتنے گریں کہ پھولوں کی قبر بن جائے"

جگدیپ نے اپنی ہتھیلی ریکھا کے ہونٹوں پر رکھ دی -

دیدی کوئی اخبار والا آیا ہے آپ کی مزاج پرسی کےلیے انٹرویو لینے آئے ہیں" ریکھا کی سہیلی نے آکر کہا -

ان سے کہہ دو کہ میں اس وقت پھولوں کی باتیں کر رہی ہوں ـــــ دو کوڑی کی
باتیں کرنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے ۔"
ریکھا کی سہیلی سے اپنے آنسو نہ پیئے گئے اور وہ اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی ۔

دوسرے دن جگدیپ جب آیا تو اس نے ریکھا کے پلنگ کے پاس پڑی ہوئی میز
پر پھولوں کا ڈھیر لگا دیا ریکھا نے کئی بار ان پھولوں سے اپنی مٹھیاں بھر لیں ۔
مٹھیاں بھر لیتی ـــ کھول دیتی اور پھر بھر لیتی ۔
"آج میں بہت خوش ہوں ـــ گذشتہ رات مجھ کو یہی محسوس ہوتا رہا جیسے میں
زرد رنگ کے پیڑ کے نیچے سوئی پڑی ہوں ـــ میرے نیچے پھولوں کا فرش ہو اور
میرے اوپر پھولوں کی چادر ہو ـــ !"
"کیا تمہیں وہ تصویر یاد ہے ریکھا ـــ سپنا ـــ ؟"
ہاں ـــ ستاروں کی پوشاک والی ـــ پہلے وہ صرف نوراں تھی پھر تم نے
اس میں میری صورت بھی سمو دی تھی ۔"
" سرکار نے "نیشنل آرٹ گیلری" کے لیے مانگ لیا ہے ۔"
" اچھا تو زمانہ کی دیوار پر میرا نام بھی لکھا گیا ـــ !" ریکھا ہنس پڑی ـــــ
مگر زندگی کی دیوار پر اپنا نام کوئی نہیں لکھ سکتا دیپ ـــ زمانے کی دیواروں کا
کوئی کیا کرے ـــ ریکھا کی آنکھوں میں ڈبڈبا آئے ۔

جگدیپ سے کچھ نہ کہا گیا۔

تم نے ستاروں والے دوپٹہ کے ساتھ میری ایک تصویر بنائی ہے نا"
جگدیپ اپنی زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ ــــ صرف سر کو جنبش دیتے ہوئے اس نے کہا "ہاں"

اس رات ریکھا کو خون آلود متلی آئی اور وہ بیہوش ہو گئی ــــ دوسرے دن صبح کو جب جگدیپ آیا ریکھا بیہوش تھی اور اس کے ارد گرد ڈاکٹر ہی ڈاکٹر تھے۔ ریکھا کا سانس اکھڑ گیا ــــ جگدیپ کا دل تڑپ اٹھا۔ ــــ "آج میں نے خدا کو دوسری بار آزما لیا ــــ وہ سچے دلوں کی بات سنتا ہے نہ پاکیزہ دلوں کی"
ریکھا کے سانس ختم ہو گئے ــــ جگدیپ کے چلتے ہوئے سانسوں میں جیسے جان نہ رہی ہو۔

جگدیپ کے دل پر کیا گذر رہی تھی اس کا حال صرف ریکھا کی سہیلی کو معلوم تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ تو رو سکتی تھی۔ دل کھول کر رو سکتی تھی مگر جگدیپ رو بھی نہیں سکتا تھا ــــ وہ جگدیپ کے قریب آکر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

"ایک بات سنو ــــ" جگدیپ کے منہ سے نکلا۔

"ریکھا نے ستاروں والا دوپٹہ مانگا تھا۔!"

"ہاں ــــ"

"وہ لے دیدو"

جگدیپ سے جایا نہیں جاتا تھا ــــ ریکھا کی سہیلی نے جگدیپ سے چابی لی اور اس کے گھر جا کر اس کا صندوق ٹٹول کر ستاروں والا دوپٹہ لے آئی ــــ جگدیپ کو

یوں لگا اُسکی ماں نے جھانجریں اور دوپٹہ اس کے لیے دو امانتیں رکھی تھیں
جھانجریں اس کی شہرت نے پہن لی تھیں اور دوپٹہ آج ریکھا نے اوڑھ لیا تھا۔
"یہ دوپٹہ ریکھا نے ایک مدت سے رکھا ہُوا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ
مَیں آخری وقت پر یہ دوپٹہ اسے اڑھا دوں"
ریکھا کی سہیلی نے ریکھا کے خاوند سے کہا اور ریکھا کے سر پہ دوپٹہ ڈالتے ہوئے
اسے یوں محسوس ہوا کہ آج اس نے جھوٹ بولا تھا لیکن اس سے بڑا سچ شاید کوئی تھا نہیں۔
اب اخباری نمائندوں کو کوئی روک نہیں سکتا تھا وہ اپنے قلم لے آئے۔
کیمرے لے آئے جگدیپ ریکھا کے سر پہ لپٹا ہُوا ستاروں والا دوپٹہ دیکھ رہا تھا۔
کہ ریکھا کی سہیلی نے کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ جگدیپ کے ہاتھ میں دیدیا رات
کو جب ریکھا کی حالت خراب ہوگئی تھی تو اس نے دو شعر کہے تھے اور کہا تھا کہ تمہیں دیدوں۔
جگدیپ نے کاغذ کی تہہ کھولی۔ لکھا تھا۔

دِرِ جمیل پہ سورج برات لے آیا!
کوئی کرن بھی قدم اس کے اٹھ کے لے نہ سکی
ہمارے عشق نے سادہ سا اک سوال کیا
کہ جس کا ساری خدائی جواب دے نہ سکی

وقت تھرتھراتا ہوا رک گیا۔ جیسے اس سوال کو پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا ہو۔ اور
پھر سر جھکا کر اپنے راستے پر ہو لیا۔ جیسے اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔